قیامت سے پہلے تین قیامتیں

اسباب اور عالمگیر اثرات

(مستقبل میں زمین دھنس جانے کے تین واقعات یعنی خسوف کا بیان)

بحر ہند کے سونامی اور پاکستان کے حالیہ زلزلے کے تناظر میں آنحضورﷺ کی تین پیشگوئیوں کے متعلق لکھی جانے والی تحریر

از: محمد نذیر یٰسین

۱۱ اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس کے پاس خبردار کرنے والے آ چکے تھے۔۱۱ (سورۃ الشعراء/ 208)

www.hamditabligh.net

انتساب

اُن رہنماؤں اور کارکنوں کے نام جو توفیقِ الٰہی سے خود کو اقامتِ دین وغلبہء دین کی جدوجہد میں کھپائے ہوئے ہیں اور نصرت الٰہی کے سزاوار ہیں

عذاب خسف کا باعث بننے والا معاشی فتنہ اور اس کا انجام قرآن کی نظر میں

(۱) ''اور نہیں بھیجا ہم نے کس بستی میں کوئی متنبہ کرنے والا مگر کہا (اُس سے) اس کے خوشحال لوگوں نے! بلاشبہ ہم ان (احکام) کا انکار کرتے ہیں جو تم دے کر بھیجے گئے ہو۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم (تم سے) مال واولاد میں زیادہ ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں دیا جائے گا۔ آپؐ فرمائیے! بے شک میرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ (اس کی حکمتوں کو) نہیں جانتے)۔'' (سورہ سبا ۳۶۔ ۳۴)

(۲) ''اور بالتحقیق ہم نے آپؐ سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر ہم نے ان کو مصائب وآلام میں مبتلا کر دیا تا کہ وہ (اللہ کے حضور) عاجزی کے ساتھ جھک جائیں۔ تو کیوں نہ جھکے وہ جب آئی ان کی طرف (ہماری جانب سے) سختی؟ بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال خوشنما بنا کر رکھ دیئے۔ پھر جب وہ بھول گئے اس (نصیحت) کو جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح (کی نعمتوں) کے دروازے کھول دیئے۔ حتیٰ کہ جب وہ خوب مگن ہو گئے ان نعمتوں میں جو انہیں دی گئی تھیں، ہم نے ان کو پکڑ لیا (اچانک) اور اب ان کا یہ حال تھا کہ ہر خیر سے مایوس ہو گئے۔ الغرض جڑ کاٹ دی گئی اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

(سورۃ الانعام ۴۵۔۴۲)

(۳) ''اور جب ہم نے کسی بستی کی ہلاکت کا ارادہ کیا تو اس کے خوشحال لوگوں کو (نافرمانیوں اور برائیوں پر) مامور کر دیا۔ پس انہوں نے اس (بستی) میں فسق وفجور کا بازار گرم کر دیا تو اس پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا۔ پس ہم نے اسے تباہ وبرباد کر ڈالا'' (بنی اسرائیل ۱۶)

(۴) ''اور کتنی ہی ہلاک کر چکے ہیں ہم وہ بستیاں جو اپنی معیشت پر اِترا گئی تھیں۔ پس یہ رہے ان کے مسکن جو آباد نہ ہوئے ان کے بعد مگر بہت کم

اور ہم ہی ان کے وارث تھے۔'' (سورۃ القصص ۱۸۔۱۶)

(۵)۱۱ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اَمر اللہ (اللہ کے دین) سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا سخت ترین محاسبہ کیا اور انہیں بدترین سزا دی۔ پس انہوں نے اپنے کئے کی سزا چکھی اور اُن کے امر (دین اللہ سے منحرف نظام زندگی) کا انجام ہوا بدترین خسارہ ۔۱۱ (سورۃ الطلاق ۹۔۸)

(۶) ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی ایسی قومیں ہلاک کر ڈالیں جنہیں اقتدار دیا تھا ہم نے زمین میں ایسا اقتدار کہ نہیں عطا کیا ہم نے تمہیں بھی۔ اور ہم نے ان پر آسمان سے موسلا دھار مینہ برسایا اور ہم نے ان کے (گھروں کے) نیچے نہریں رواں کر دیں۔ پھر ہلاک کر دیا ہم نے انہیں ان کے گناہوں کے سبب اور (پھر) ہم نے پیدا کیا ان کے بعد دوسری قوموں کو۔''

(سورۃ الانعام ۶)

مستقبل میں عذابِ الٰہی کی وعیدیں

(۱) ''اور آپ کا پروردگار بخشنے والا، رحمت فرمانے والا ہے۔ اگر وہ ان (ظالموں) کو ان کے کرتوتوں کے سبب پکڑنے لگے تو فوراً ان پر عذاب بھیج دے بلکہ (اس نے تو) ان کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ (اُس وقت) اس کے عذاب سے پناہ کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔ اور یہ جو بستیاں (آثار قدیمہ کی شکل میں ویران پڑی) ہیں، ہم نے انہیں ہلاک کر دیا تھا جب انہوں نے (ایک مقررہ حد سے زیادہ) ظلم کیا تھا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔''

(سورۃ الکھف ۵۹۔۵۸)

(۲) ''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس (کی ہلاکت) کے لئے ایک نوشتہ (پہلے سے) طے شدہ تھا۔ نہیں آگے نکل سکتی کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے پہلے اور نہ (ہی) پیچھے رہ سکتی ہے۔'' (سورۃ الحجر ۵۔۴)

(۳) ''کیا نہیں ہلاک کر دیا ہم نے پہلوں کو؟ پھر انہیں کے نقش قدم پر چلائیں گے ہم بعد والوں کو (بھی)۔ یہی کچھ کیا کرتے ہیں ہم مجرموں کے ساتھ۔'' (سورۃ المرسلٰت ۱۸۔۱۶)

(۴) ''ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے۔ پس عنقریب تم (اس حقیقت کو) جان لوگے۔'' (سورۃ الانعام ۶۷)

کتاب ہذا کے متعلق تاثرات

(۱)

نذیر یاسین صاحب کی کتاب

"قیامت سے پہلے تین قیامتیں"

پر ایک اجمالی تبصرہ

جناب نذیر یاسین صاحب کی کتاب "قیامت سے پہلے تین قیامتیں" کئی خصوصیات کی حامل ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

(1) یہ کتاب انذار و تبشیر کا متوازن مجموعہ ہے۔ نوعِ انسانی اور بالخصوص دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں پر ظلم و ستم کرنے والے کافروں کے لئے اور ان کا ساتھ دینے والے نام نہاد

مسلمانوں کے لئے اس کتاب میں شدید وعیدیں ہیں۔ دوسری طرف دینِ اسلام کے غلبہ کے لئے مال وجان کی قربانیاں دینے والوں کے لئے خوشخبریاں ہیں کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شاملِ حال ہوگی اور دین کے دشمن ذلت ورسوائی سے دوچار ہوں گے۔

(2) مصنف نے دنیا میں اس وقت موجود مختلف عناصر کو ماضی کے مختلف کرداروں سے بڑی صحیح اور مدلل مناسبت دی ہے۔ امریکہ اس وقت فرعون کا کردار ادا کر کے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا متکبرانہ نعرہ لگا رہا ہے۔ مسلمان ممالک کے حکمران قارون کی طرح ملکی وسائل سے ذاتی تجوریاں بھر رہے ہیں اور فرعونِ وقت کے ایجنٹ بن کر غیرت مند مسلمان مجاہدین پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور پاکستانی قوم اپنے حکمرانوں کے کردار کی وجہ سے کتے سے مشابہت کی ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ کتے کی ایک خصلت یہ ہے کہ اپنوں کا دشمن اور غیروں کا وفادار ہوتا ہے۔ ہم بھی اپنوں کے دشمن اور کافروں کے اتحادی ہیں۔ دوسرے یہ کہ کتا لالچ کی ایک علامت ہے۔ ہم نے بھی لالچ کی انتہا کر دی۔ وسطی ایشیا کی ریاستوں کے وسائل سے استفادے کی لالچ میں طالبان کی حکومت قائم کرنے میں مدد کی۔ امریکی امداد کے لالچ میں پہلے طالبان کا ساتھ دیا، پھر اسی لالچ میں طالبان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور ڈالروں کی لالچ میں مجاہدین کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا۔ تیسرے یہ کہ کتے میں غیرت نہیں ہوتی۔ دھتکارو تو دفع ہو جائے گا اور پچکارو تو فوراً دم ہلاتا ہوا لوٹ آئے گا۔ قیامِ پاکستان کے بعد امریکہ نے پچکارا تو ہم "سیٹو" اور "سینٹو" میں شامل ہو گئے۔ امریکہ نے 1965ء کی جنگ میں دھتکارا اور جنگ کے دوران مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر پچکارا اور امریکہ کے چین کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں ذریعہ بن گئے۔ پھر دھتکارا اور 1971ء کی جنگ میں کوئی مدد نہ کی۔ پھر پچکارا اور ہم افغانستان میں روس کے خلاف اس کے سرگرم حامی بن گئے۔ پھر دھتکارا اور کئی طرح کی پابندیاں ہم پر لگا دیں۔ "9/11" کے بعد امریکہ نے پھر پچکارا اور ہم اس کے اتحادی بن گئے۔ اب وہ پھر ہم سے چھڑی اور گاجر (Stick and carrot) کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے لیکن ہم پھر بھی اس کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔

(3) اس کتاب میں مادّہ پرستی کی بڑی مؤثر نفی ہے۔ امت مسلمہ کے اکثر بہی خواہ مسلمانوں کو موجودہ افسوس ناک حالات سے نکلنے کے لئے ٹیکنالوجی اور اسباب میں مغرب کا ہم پلہ ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کامیابی کے لئے فیصلہ کن اہمیت اسباب کی نہیں، اللہ کی مدد کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ .

(آلِ عمران:160)

اُمت کی موجودہ افسوس ناک صورت حال میں مصنف کی یہ بات حوصلہ دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آفات کے ذریعے ظالموں کو ہلاک کر کے اہلِ ایمان کی نصرت کا سامان فرمائے گا۔

بلاشبہ نذیر یاسین صاحب کی یہ کاوش حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے چشم کشا حقائق اور ایمان افروز مضامین پر مشتمل ہے جس کا مطالعہ امت کا درد رکھنے والے ہر فرد اور بالخصوص غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے والے کارکنوں کے لئے بہت مفید رہے گا۔

انجینئر نوید احمد

اکیڈمک ڈائریکٹر انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی

(۲)

۱۱ زیرتبصرہ کتاب ۱۱ قیامت سے پہلے تین قیامتیں ۱۱

محمد نزیر یٰسین کی تالیف ہے جو اگرچہ باقاعدہ تصنیف وتالیف کے شعبہ سے تو وابستہ نہیں لیکن تحریکی مزاج اور حالات حاضرہ پر مسلسل نظر رکھنے کی وجہ سے ان کے قلب ونظر میں جو پختگی اور زرف نگاہی کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے، دراصل وہ سبب بنی ہے اُن کے قلم کی جولانی اور روانی کا، جس کی بدولت موصوف نے ایک ایسے موضوع (زمین کے تین خسوف) پر کتاب لکھی بلکہ لکھنے کا حق ادا کیا جس پر لکھنا دوسرے موضوعات کے مقابلہ میں کافی مشکل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس خاص موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ پھر جو دو چار کتابیں لکھی گئی ہیں اور جن کا راقم نے مطالعہ کیا ہے، وہ میرے نزدیک اس اعتبار سے اپنے موضوع پر سند بن کر داد تحسین حاصل نہ کر سکیں کہ فاضل مؤلفین نے نہ تو اپنی آراء میں کوئی خاص ترتیب قائم کی نہ قرآن وحدیث میں اس نوع کے وارد شدہ واقعات کا آپس میں ربط وضبط قائم کیا نہ حالات حاضرہ پر اُن واقعات سے رونما ہونے والے نتائج کا انطباق کیا اور نہ ہی تاریخی اعتبار سے اُن واقعات کا ماضی حال اور مستقبل سے رشتہ جوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کتابوں کے مطالعہ سے اگرچہ خاص قاری تو استفادہ کرتا رہتا ہے لیکن درج بالا خامیوں کی وجہ سے عام قارئین ان کتابوں سے کم ہی مستفید ہوئے۔

اسکے برعکس زیرتبصرہ کتاب کا انداز عام فہم، عبارتیں رواں اور سلیس، مضامین میں تنوع، حالات حاضرہ پر ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں انطباق، نیز جا بجا علماء کرام اور دانشوران اُمت کے ٹھوس دلائل نے اسکی معنوی اور روحانی حیثیت کو اس حد تک اُجاگر کیا ہے کہ اس سے عام قاری بھی استفادہ کر سکتا ہے۔

یہ کتاب جن حالات میں لکھی گئی ہے، اس سے کتاب کی افادیت از خود بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت بین القوامی حالات میں جو بلا کی تیزی آئی ہے، اس نے اُمت مسلمہ کو ایک ایسے

مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں مزید سنبھلنے کی طاقت اس میں دکھائی نہیں دیتی بلکہ صاف نظر آ رہا ہے کہ اُمت کا مستقبل نہایت تاریک ہے اور قوی اندیشہ ہے کہ باطل قوتیں مسلمانوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں گی جیسا کہ تاتاریوں کے فتنہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کا حشر ہوا تھا۔ مگر اس کتاب کے مطالعہ سے اس نقطۂ نظر کی تردید ہو جاتی ہے اور قاری سمجھ جاتا ہے کہ اُمت مسلمہ جس نظریہ اور دین کے ساتھ وابستہ ہے، وہ نظریہ اور اسکی بنیاد پر بننے والا نظام زندگی کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔ باطل کا یہ غلبہ وقتی ہے اور جلد یا بدیر حالات توفیق الٰہی سے اُمت مسلمہ کے حق میں بدل جائیں گے۔

میری مخلصانہ رائے تو عام قارئین کو بھی ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں اور اپنی بساط علمی وذہنی کے موافق اس سے خیر اور نیکی کمائیں۔ لیکن بطور خاص تحریکی مزاج کے کارکنوں سے جو مختلف دینی اور مذہبی جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے باطل قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں، عرض ہے کہ وہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فاضل مئولف کی اس سعی کو قبول فرمائے اور اسے مزید توفیق دے کہ وہ اُمت کی اس نہج پر رہنمائی کرتا رہے۔ آمین ثم آمین!

مولانا غلام اللہ خان حقانی

فارغ عن التحصیل مدرسہ نُصرت العلوم، گوجرانوالہ

اوچ، دیر پائین

(تبصرہ، شائع شدہ، ماہنامہ حکمت القرآن، مارچ، ۲۰۰۷)

(۳)

مصنف نے یہ کتاب اسلام کی خدمت اور مسلم اُمہ کے لئے تبلیغ کی غرض سے لکھی ہے۔

وہ دو اہم قرآنی نکات کو بھی اپنے مدنظر رکھتے ہوئے اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔

یہ دو نکات: (۱) عذاب سے قبل قوم کا اپنے اعمال بد سے واقف ہونا۔

(۲) ایمان کامل رکھنے والوں کا عذاب الٰہی سے محفوظ رہنا۔

اگر قوم اپنے فرض سے غافل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی اصلاح اور تعلیم وتربیت کے لئے اپنے نمائندے بھیجتا ہے۔

اس کتاب میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، وہ قابل تحسین ہیں۔

مصنف کی موجودہ حالات پر گہری نظر ہے۔ اسکے علاوہ اُن میں حالات کے دھارے کے مطابق نتائج وعواقب کا جائزہ لینے کی صلاحیت بھی ہے۔ اُمت مسلمہ کے حالات اور اعمال کے ساتھ ساتھ موجودہ قائدین اسلام کی شخصیات اور انکی خصوصیات کے حوالے سے بھی لکھا گیا ہے۔

سورہ یٰسین قرآن مجید کا قلب ہے۔ اکثر کا اسکی تلاوت کرنا معمول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کو زبانی یہ سورت یاد ہے۔ مگر اس میں مذکور ۱۱ اصحاب قریہ ۱۱ کے واقعہ سے نزیر یٰسین کے نتائج قابل تحسین ہیں۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت کے مسلم اُمہ کے درد کے حوالہ سے اپنی ایک نمایاں حیثیت ہے، جس کو مصنف نے بڑے اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔

موجودہ مایوسی کے دور میں یہ کتاب اُمید کی ایک کرن ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ دوستوں کو تحفہ دینے کے لئے بھی بہتریں ہے۔

ہفت روزہ، خبریں، سنڈے میگزین

(شائع شدہ ۳۱ دسمبر، ۲۰۰۶)

کتاب ھذا کی تصنیف کا پسِ منظر

سطور درج ذیل کا راقم (محمد نذیر) باقاعدہ طور پر مصنف ہے اور نہ ہی محقق بلکہ تحریک اسلامی کا ایک ادنیٰ سا کارکن ہونے کے ناطے اپنے محدود علم اور غور وفکر کے نتیجہ میں اس عاجز نے جو نتائج اخذ کئے ہیں انہیں ایک گہرے احساسِ فرض کے ساتھ دوسروں کو منتقل کر رہا ہے۔ اپنی اس کتاب کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے راقم اپنا مختصر سا تعارف قارئین کے سامنے رکھنا چاہے گا تا کہ قارئین کتاب ھذا کا پس منظر صحیح طور پر جان سکیں۔ راقم کی پیدائش ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ 1991ء میں وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ بعد ازاں حصول علم کے لئے لاہور چلا آیا۔ یہاں آ کر راقم کا رجحان تعلیم کی طرف کم اور مختلف دینی جماعتوں کی طرف زیادہ رہا جن میں تقریباً تمام مکاتب فکر کی جماعتیں شامل ہیں۔ ان متنوع قسم کی جماعتوں کے ساتھ وابستگی کی بنیادی وجہ ' تلاش حق ' تھی۔

اس تلاش حق کی دُھن مجھ پر حضور اکرم ﷺ کی اُس مشہور حدیث کی وجہ سے سوار ہوئی جس میں آپ ﷺ نے اپنی اُمت کے تہتر فرقوں میں بٹ جانے کی خبر دی ہے۔ (عن عبداللہ بن عمروؓ رواہ ترمذی) ان میں سے صرف ایک فرقہ کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ (جہنم سے) نجات پانے والا ہوگا۔ بالعموم اس حدیث مبارکہ کے صرف یہی الفاظ سننے کو ملتے ہیں حالانکہ جب آپ ﷺ نے یہ خبر اپنے صحابہ کرامؓ کو دی تھی تو انہوں نے استفسار کیا تھا کہ یا رسول اللہ! یہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا! وہ لوگ جو اُس طریقہ پر چلیں گے جس پر میں اور میرے صحابہ کرامؓ چل رہے ہیں۔

یہ حدیث مبارکہ ہمارے لئے واضح طور پر 'معیارِ حق' کا تعین کر دیتی ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس حدیث کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا جاتا اور صحابہ کرامؓ کا سوال اور آپ ﷺ کا جواب بالعموم حذف کر دیا جاتا ہے تا کہ لوگ معیارِ حق سے واقف نہ ہو سکیں۔ ایسا کرنے والوں کا طرزِ عمل راقم کے نزدیک قرآن حکیم کی درج ذیل آیات میں بیان کیے گے یہود کے طرزِ عمل کی عکاسی کرتا ہے:

" اور جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم ضرور اسکو لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہو گے اور اسکو چھپاؤ گے نہیں تو تم نے اپنے اس عہد کو پسِ پُشت ڈال دیا اور اسے حقیر قیمت کے بدلے بیچ ڈالا۔ پس بہت ہی برا ہے وہ کاروبار جو یہ کر رہے ہیں۔ ۱۱

(آل عمران ۱۸۷)۔

المختصر تلاش حق کے اس سفر کے دوران راقم کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں سے پتہ چلا کہ اسلام ایک دین (مکمل ضابطہ حیات) ہے نہ کہ مذہب۔ مذہب کا تعلق صرف مخصوص عبادات ورسومات سے ہوتا ہے نہ کہ پورے نظام حیات سے۔ دین کا مطلب ہی چونکہ نظام ہے اور نظام کتابوں میں پڑھنے کیلئے نہیں بلکہ نافذ ہونے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ دین اسلام نہ صرف اپنے نفاذ چاہتا ہے بلکہ غلبہ بھی چاہتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کے لئے ہے لہذا آپ ﷺ کا لایا ہوا دین پورے کرہ ارض پر اپنا نفاذ وغلبہ چاہتا ہے۔ آپ ﷺ پر چونکہ نبوت ورسالت کا خاتمہ ہو چکا ہے لہذا آپ ﷺ کے دین کو غالب کرنا آپ ﷺ کی اُمت کا فرض منصبی ہے لیکن آج اُمت اپنے اس فریضہ کو بالکل نظر انداز کر چکی ہے۔ آج اللہ کا دین کُرہ ارض پر غالب ہونا تو کجا کسی ایک مسلمان ملک میں اپنی حقیقی روح کے مطابق نافذ بھی نہیں ہے۔

نفاذ اسلام اور غلبہ اسلام کے اس عظیم فریضہ کی ادائیگی کیلئے ہی مولانا مودودیؒ مرحوم نے اُمت کو یہ نعرہ دیا تھا کہ "قرآن وسنت کی دعوت کو لیکر اُٹھو اور پوری دنیا پر چھا جاؤ۔" اپنے اسی فریضہ کا احساس کرتے ہوئے میں نے جماعت اسلامی سے وابستگی اختیار کر لی لیکن جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ جس طریقہ کار پر جماعت اسلامی چل رہی ہے اور جس طرزِ عمل کو اس نے اپنایا ہوا ہے، نفاذ اسلام وغلبہ اسلام کی منزل کو اس طریقہ کار وطرزِ عمل کے ذریعے حاصل کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

حُسن اتفاق سے انہی دنوں میرا تعارف ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی سے ہوا جو اُن دنوں تحریک خلافت کا آغاز کر چکی تھی۔ تنظیم اسلامی کے نہ صرف انقلابی طریقہ کار نے مجھے متاثر کیا بلکہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریروں وتقاریر نے میرے دل ودماغ میں پائی جانے والی اُن بہت سی غلط فہمیوں واشکالات کو بھی دور کر ڈالا جن کا تعلق ایمانیات سے ہے اور جن کی بناء پر ہم ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ بازی کرتے رہتے ہیں۔ الغرض جس راہِ حق اور راہِ نجات کا میں متلاشی تھا، وہ مجھے ڈاکٹر اسرار احمد کے کتابچے " راہ نجات، سورۃ والعصر کی روشنی میں "صاف دکھائی دینے لگی اور میں تنظیم اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو گیا لیکن افسوس یہ وابستگی دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔

تنظیم اسلامی سے دُوری کی وجہ کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ دو اور جماعتوں سے میرا متعارف ہونا تھا جو تقریباً اُسی طریقہ کار کی مدعی تھیں جن پر تنظیم اسلامی عمل پیرا تھی۔

ان میں سے تحریک ولی اللّٰہی خفیہ دعوت کے ذریعے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہی تھی تو مولانا اکرم اعوان کی جماعت "الاخوان" رب کی دھرتی، رب کا نظام کا نعرہ بر سرِ عام لگا کر حکمرانوں کو چیلنج کر رہی تھی۔ تقریباً ایک جیسے طریقہ کے مطابق اسلامی انقلاب کی داعی یہ تینوں جماعتیں آپس میں متحد نہ تھیں اور میرے لئے یہ بہت دُکھ اور افسوس کی بات تھی۔ مزید برآں سیرت رسول ﷺ اور سیرت صحابہؓ کی روشنی میں جن اعلیٰ معیارات کو میں اپنے دل و دماغ میں راسخ کر چکا تھا، وہ بھی کسی جماعت میں بظاہر نظر نہ آئے۔

ان مختلف جماعتوں کے ساتھ وابستگیوں کے نتیجہ میں میری تعلیم کا بھی بہت حرج ہوا تھا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ میری تمام جماعتوں کے ساتھ دلچسپی ووابستگی ختم ہوتی چلی گئی اور بالآخر میں بھی اُن بہت سے لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا جو کبھی کسی دینی جماعت سے وابستہ رہے یا کسی دینی مدرسہ سے تعلیم حاصل کی اور پھر اس دنیائے فانی کے دھندوں میں ہی اُلجھ کر رہے گئے۔ تاہم مجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضلِ خاص یہ رہا کہ میں نے خود کو 'کبائر' سے بچا رکھنے کی ہر ممکن سعی کی اور حالاتِ حاضرہ سے اپنی دلچسپی کو برقرار رکھا۔

زندگی کئی سالوں تک اسی ڈگر پر بسر ہوتی رہی یہاں تک کہ 11 ستمبر 2001ء کو امریکہ میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہوئے۔ ان واقعات کو بہانہ بنا کر امریکہ نے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ حضرت ملا عمر کی سربراہی میں قائم طالبان حکومت نے ہر قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت کے خلاف عزیمت واستقامت کی وہ مثال قائم کی جو صرف قرون اولیٰ میں ہی نظر آتی ہے۔ طالبان کے جذبہ ایمانی نے میرے ایمان کو بھی جلا بخشی۔ جنگ کے دوران ہی رمضان المبارک کا مقدس مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ لہذا اپنی سابقہ غفلتوں سے تائب ہونے کی تحریک دل میں

پہلے سے کہیں بڑھ گئی جس نے قدم بقدم مجھے مکمل دین کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا۔ طالبان اور عرب مجاہدین کی استقامت دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال تقویت پا چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور نُصرت فرمائے گا اور فتح اُنہی کے قدم چومے گی۔ جنگ دن بدن اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی، مزار شریف کے بعد کابل پر بھی قبضہ کیا جا چکا تھا۔ قندھار پر قبضہ زیادہ دور دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اللہ کی نصرت کے آثار (ظاہری طور پر) کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

انہی دنوں اخبار میں ملا عمر مجاہد کا بی بی سی پشتو سروس کو دیا گیا بیان پڑھا کہ

'' بی بی سی میری اس پیشگوئی کو نوٹ کر لے کہ امریکہ جلد تباہ ہو جائے گا اور اپنی تباہی کا منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔''

جب اس پیشگوئی کے متعلق ایک طالبان عہدیدار سے استفسار کیا گیا تھا تو اس نے جواب دیا تھا کہ "امیر المومنین ایک درویش انسان ہیں لہٰذا ممکن ہے انہوں نے کوئی ایسا خواب دیکھا ہو۔''

جنگ سے پہلے حکومت پاکستان نے علماء کا جو وفد طالبان کو سمجھانے بجھانے کے لئے بھیجا تھا، اس کے متعلق بھی خبر آئی تھی کہ ملا عمر نے خواب میں نبی کریمؐ کی زیارت کی ہے اور آپ ﷺ نے انہیں امریکہ کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حُسنِ اتفاق سے اُنہی دنوں اخبار میں تنظیم اسلامی کے ایک کارکن کی فوٹو دیکھی جو دینی جماعتوں کے اتحاد دفاعِ پاکستان و افغانستان کونسل کے مشترکہ امریکہ مخالف مظاہرے میں شریک تھا۔ تنظیم اسلامی کے ساتھ چونکہ میری وابستگی رہ چکی تھی اور اس کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد کو میں ایک معتبر اسلامی سکالر سمجھتا تھا لہٰذا ان کے خطاب جمعہ کو سننے کی امنگ دل میں بیدار ہوئی تا کہ طالبان کے بارے میں ان کے خیالات سے آگاہی ہو سکے۔ اگلے روز جمعہ کا دن تھا لیکن اُسی دن (۷، دسمبر بروز جمعرات) کو خبر سنی کہ طالبان نے قندھار کا اقتدار ملا نقیب کے حوالے کر کے خود روپوشی اختیار کر لی ہے۔ تاہم میں پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا خطاب سننے باغِ جناح پہنچ گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ''سورۃ الروم'' کی ابتدائی آیات تلاوت کیں اور انہی کے حوالے سے خطاب کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ طالبان حکومت بظاہر ختم ہو گئی ہے لیکن سورۃ الروم کی ان آیات کو حضور اکرمؐ کی اس حدیث ''اس قرآن میں تم سے پہلوں کی خبریں بھی موجود ہیں اور تمہارے بعد والوں کی بھی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ صورت حال پر منطبق کیا جائے تو طالبان کی یہ پسپائی محض عارضی ہے اور وہ انشاءاللہ دوبارہ برسرِ اقتدار آئیں گے اور اُس وقت تک امید ہے کہ افغانستان کی قریب ترین سرزمین ''پاکستان'' میں بھی اسلامی انقلاب آ چکا ہو گا۔ سورۃ الروم کی یہ آیات ٹھیک طالبان پر منطبق ہوں تو ان کا دوبارہ ظہور زیادہ سے زیادہ نو سال میں ہو جائے گا یعنی 2010ء تک۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حوالے سے وارد ہونے والی احادیث کا بھی تذکرہ کیا جن میں سے مشہور ترین یہ ہے کہ ''خراسان سے سیاہ پرچم نکلیں گے اور انہیں کوئی چیز نہ روک سکے گی حتیٰ کہ وہ بیت المقدس میں نصب ہو جائیں گے۔'' خراسان کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ اگرچہ خراسان آج کل ایران کا ایک صوبہ ہے لیکن ماضی کا خراسان ایک بڑی مملکت پر مشتمل تھا اور اس مملکت کا قلب افغانستان کا علاقہ قرار پاتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے طالبان کے متعلق نیک خیالات اور اُن کی طالبان کے لئے بھرپور حمایت میرے لئے کوئی عام سی بات نہ تھی۔ بطور داعی تحریک خلافت اُن کا طالبان کو سپورٹ کرنا یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب بذات خود مُلا عمر مجاہد کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ یقیناً جو شخص خود مخلص ہو اور صراط مستقیم پر گامزن ہو، وہ دوسروں کیلئے بھی اخلاص اور خیر خواہی کے جذبات ہی رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے خطاب جمعہ اور امیر المومنین مُلا عمر مجاہد کی پیش گوئی نے میرے دل میں امید کی شمعیں روشن کر دیں اور مجھے بھی نبی کریم ﷺ کی پیش گوئیوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ میرا گمان تھا کہ امریکہ کے متعلق جو پیش گوئی مُلا عمر نے کی ہے، اُس کا تذکرہ حضور ﷺ کی پیش گوئیوں میں بھی ضرور ہونا چاہیے کیونکہ عام خیال یہی ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت سے قبل کے تقریباً تمام بڑے واقعات کی خبر دے رکھی ہے۔

اوّلین کتاب جس کا میں نے مطالعہ کیا "اُمت مسلمہ کی عمر" تھی۔ (از امین جمال الدین) اس مطالعہ کے دوران میری نظریں اُس حدیث مبارکہ پر خصوصاً مرکوز ہو گئیں جس میں قیامت سے قبل تین مختلف مقامات کے دھنس جانے کے واقعات کی خبر دی گئی ہے۔

تلاش کے باوجود مجھے ان تینوں واقعاتِ خسف کے متعلق زیادہ تحقیقی مواد تو نہ ملا تاہم ایک دو احادیثِ مُبارکہ عذابِ خسف کے متعلق ضرور مل گئیں۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد تلاوتِ قرآن کے دوران خسفِ قارون کے واقعہ نے اچانک میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ لہٰذا قارون کے کردار پر غور و فکر و مطالعہ کرنا پڑا جس نے مجھے عذابِ خسف کی حقیقت اور قارون کے حقیقی کردار کو سمجھنے میں بہت مدد دی۔

مزید غور و فکر اور مطالعہ حالات حاضرہ کے نتیجہ میں زمین کے تین خسوف کے متعلق مجھے کافی حد تک انشراح صدر ہو چکا تھا جس نے میرے دل میں یہ احساس جاگزین کرنا شروع کر دیا کہ مجھے اپنے خیالات قلمبند کر کے ابلاغِ ابلاغ ادا کرنا چاہئے۔

ایک ایسے موضوع کے متعلق لکھنا جس کے متعلق یا تو پہلے لکھا ہی نہ جا چکا تھا اور یا پھر ایک آدھ مصنف مثلاً جامعۃ الازہر کے پروفیسر امین جمال الدین (کتاب، اُمتِ مسلمہ کی عمر) نے لکھا ہی تھا تو اس سے اختلاف رائے کرتے ہوئے لکھنا بہت ہمت کا کام تھا جبکہ یہ موضوع بھی بہت حساس اور نازک ہونے کے ناطے زیادہ ذمہ داری کا حامل تھا۔ لہٰذا ان وجوہات کی وجہ سے مجھے کچھ بھی لکھنے کی ہمت نہ پڑی اور وقت یونہی گزرتا رہا۔

2004ء کے رمضان المبارک کے دوران مجھ پر اس موضوع سے متعلق خیالات کا غلبہ اس قدر زیادہ ہوا کہ خواب بھی اِسی قسم کے آنے شروع ہو گئے۔ اب میرے دل میں یہ احساس قوی ہوتا جا رہا تھا کہ اگر میں نے اپنے خیالات قلمبند کر کے حقِ ابلاغ ادا نہ کیا تو عین ممکن ہے روزِ قیامت مجھ سے باز پرسی کی جائے کہ جو تمہارے پاس تھا، اسے لوگوں تک پہنچایا کیوں نہیں؟ اس باز پرسی کے خوف سے میں نے تہیہ کر لیا کہ اب ضرور اس موضوع پر لکھوں گا۔ رمضان المبارک بھی گزر گیا اور مزید دو تین مہینے بھی گزر گئے لیکن اس موضوع پر لکھنے کی ہمت پھر بھی پیدا نہ ہو سکی۔

دن گزرتے گئے یہاں تک کہ 26 دسمبر 2004 کا دن آن پہنچا جب بحر ہند میں آنے والے خوف ناک سمندری زلزلے اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی طوفانی لہروں نے بیک وقت کئی

ممالک کے اندر قیامت صغریٰ برپا کردی۔اس واقعہ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کتاب کو سپردِ قلم کرنے کے لئے مجھے تائیدِ الٰہی سے بالآخر فیصلہ کن تحریک حاصل ہوگئی۔

چونکہ اس کتاب کے لئے اکثر و بیشتر مواد مجھے تنظیم اسلامی کے حلقہ سے میسر آیا تھا اور کتاب کے بہت سے مضامین بانی تنظیم اسلامی کی کتب سے ماخوذ ہیں اور یا پھر ان کی شرح و تائید پر مشتمل ہیں لہٰذا دورانِ تحریر کتاب (2005ء کے اوائل میں)، میں نے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر کے حضورؐ کے فرمان کے مطابق ''التزام جماعت'' کے ساتھ ساتھ ''بیعت کا قلادہ'' بھی اپنے گلے میں ڈال لیا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تنظیم اسلامی، تحریک ولی اللّٰھی اور الاخوان، وہ تین جماعتیں تھیں جن کے انقلابی فکر نے مجھے متاثر کیا تھا۔ان میں سے الاخوان تو قصہء پارینہ بن چکی ہے جب کہ تحریک ولی اللّٰھی ابھی تک گوشہء گمنامی سے باہر نہیں نکل سکی ہے حالانکہ اُس کے ایک عہدے دار کے بقول اب تک تو اُسے انقلاب برپا بھی کر دینا چاہیئے تھا۔اس تحریک کا خفیہ طریقہء دعوت ہی اسکے کردار کو مشکوک بنا دیتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ایک حقیقی اسلامی انقلابی تحریک خفیہ ہو ہی نہیں سکتی۔اُسے لازماً برسرِ عام اپنا مقصد اور لائحہ عمل عوام الناس کے سامنے رکھنا چاہیئے اور اُس تمام ردِّعمل کا سامنا کرنا چاہیے جو اُس کی مخالف قوتیں ظاہر کریں تا کہ اُس تحریک کے قائدین و کارکنان کی اپنے نظریہ سے وابستگی و ثابت قدمی کا امتحان ہو سکے۔

راقم کے خیال میں تنظیم اسلامی کے قائدین و کارکنان اپنے نظریات سے وابستگی و ثابت قدمی کا کسی حد تک امتحان دے چکے ہیں جبکہ اس سے کٹھن کئی مراحل ابھی باقی ہیں اور راقم کو بہت حد تک امید ہے کہ وہ ان مراحل کو بخوبی سر کر لیں گے (انشاءاللہ العزیز) اور یہی امید راقم کے تنظیم اسلامی میں شمولیت کا باعث بنی تھی۔

تنظیم میں شمولیت کے کچھ ہی دنوں بعد مبتدی تربیت گاہ میں شرکت کا موقع ملا۔دوران تعارفِ شرکاء میں نے اپنی کتاب کا تذکرہ بھی کر دیا۔ہمارے ناظم تربیت شاہد اسلم صاحب نے کتاب کا مسودہ دکھانے کی فرمائش کی اور بعد از مطالعہ میرے خیالات کو دادِ تحسین دی۔انہوں نے ناظم دعوت جناب رحمت اللہ بٹر سے بھی کتاب کا مطالعہ کروایا اور انہوں نے بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔رفیقِ تنظیم سید فرخ حسین نے بھی مسودہ کا مطالعہ کیا اور اظہار پسندیدگی کے علاوہ کچھ خامیوں کی نشاندہی فرمائی۔راقم نے اس مسودہ کا مطالعہ خطیب جامع مسجد نگینہ، احمد پارک، مدرس جامعہ مدنیہ، کریم پارک بشیر احمد یوسفزئی صاحب سے بھی کروایا۔ راقم کتاب ہٰذا کی تحریر کے لئے اُن کے احسانات و تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

موصوف میرے تجزیہ سے کسی حد تک تو متفق تھے تاہم وہ واقعہ اصحاب قریہ کے تناظر میں میرے تجزیہ سے متفق نہ ہوئے۔(اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)

دو اہم نکاتِ قرآنی

اس درمیانی وقفہ میں مجھے دو نکاتِ قرآنی بھی ایسے مل گئے جن سے میرے احساسِ فرض (یعنی وجہء تالیف کتاب ہٰذا) کو غیر معمولی تائید حاصل ہوئی۔یہ دو نکات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عذاب سے قبل قوم کا اپنے اعمالِ بد سے واقف ہونا۔

(۲) ایمانِ کامل رکھنے والوں کا عذابِ الٰہی سے محفوظ رہنا۔

پہلے نکتہ کا حاصل یہ ہے کہ کسی قوم پر حالتِ غفلت میں عذاب نہیں آیا کرتا۔قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں یہی نکتہ بیان کیا گیا ہے:

ذٰلِكَ اَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ رَّبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ/ وَّاَهۡلُهَا غٰفِلُوۡنَ (۱۳۱) وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ط/ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُوۡنَ (۱۳۲)

''(رسولوںؑ کا خبردار کرنا) اس لئے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کر ڈالے جبکہ وہاں کے رہنے والے (اپنے اعمالِ بد سے) ناواقف ہوں۔اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے اعمال کے مطابق جیسے وہ عمل کرتے ہیں۔اور لوگ جو بھی عمل کرتے ہیں اللہ ان سے غافل نہیں ہے۔'' (سورۃ الانعام ۱۳۲۔۱۳۱)

وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ/(۲۰۸) ذِكۡرٰى قف وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ (۲۰۹)

''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر آ چکے تھے ان کے پاس خبردار کرنے والے، نصیحت کرنے کے لئے اور نہیں ہیں ہم ظالم۔'' (سورۃ الشعرآء ۲۰۹۔۲۰۸)

ماضی میں اللہ کے رسول معبوث ہو کر اپنی قوموں کو ان کے اعمالِ بد سے آگاہ کیا کرتے تھے۔اور باز نہ آنے کی صورت میں عذابِ الٰہی کے نزول کی وعید سنایا کرتے تھے اور جب اللہ کا عذاب آتا تھا تو اس حالت میں نہ آتا تھا کہ وہ قوم اپنے کرتوتوں سے بے خبر ہوتی تھی۔

چونکہ نبی کریمؐ خاتم النبیین و رسل ہیں اور اب کوئی نبی یا رسول تو نہیں آئے گا جو اپنی وحی کے ذریعے قوم کو مستقبل کے عذاب سے باخبر کرے لہٰذا اب یہ کام اُمتیوں کے ذریعے ہی ہوگا۔نبی کریمؐ نے قیامت سے قبل مختلف قسم کے عذاب ہائے الٰہی کی پیش گوئی تو یقیناً کر رکھی ہے تاہم یہ عذاب کن اقوام پر نازل ہوں گے؟ اگرچہ اس کا قطعی و حتمی علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے تاہم حضورؐ کے امتی قرآن و حدیث اور دیگر آثار و قرائن کی روشنی میں ان عذاب ہائے الٰہی کے نزول کے امکانات رکھنے والے علاقوں کے متعلق نہ صرف رائے قائم کر سکتے ہیں بلکہ راقم کے خیال میں یہ اہلِ علم حضرات کا فرض منصبی بھی بنتا ہے کہ وہ آثار و قرائن کی روشنی میں نہ صرف رائے قائم کریں بلکہ ان لوگوں اور اقوام کو خبردار بھی کریں جو اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے عذاب الٰہی کے مستحق دکھائی دے رہے ہیں۔بلاشبہ یہ کام اب امتِ محمدؐ یہ کو ہی کرنا ہوگا۔

دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب الٰہی آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایمان کامل رکھنے والوں کو اس عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔ سورہ یونس کی یہ آیت (۱۰۳) اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے:

ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا/ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا/ کَذٰلِکَ ج حَقًّا عَلَیْنَا/ نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ/ (۱۰۳)

''پھر ہم اپنے رسولوں اور (ان پر) ایمان لانے والوں کو (عذاب سے) نجات دیتے رہے۔ اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ فرماں برداروں کو (عذاب سے) نجات دیں۔''

ماضی میں رسول وحیِ الٰہی کی بناء پر نزولِ عذاب کے وقت سے آگاہ ہو جایا کرتے تھے لہٰذا وقت کے رسول اپنے پیروکاروں کو اس بستی سے نکال لے جایا کرتے تھے۔ نبوت و رسالت کے خاتمہ کے بعد اب نزولِ عذاب کے مقام و وقت سے اگرچہ سو فیصد آگاہی تو ممکن نہیں البتہ مسلمانوں کا امیر المومنین یا کسی جماعتِ حق کا امیر اپنے خواب، الہام اور استخارہ وغیرہ کے ذریعے باذنِ الٰہی نزولِ عذاب کے وقت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

نبی کریمؐ نے پرفتن دور میں مسلمانوں کی جماعتِ حق کے امیر کے ساتھ وابستہ رہنے کی تلقین فرمائی ہے (عن حذیفہ بن یمانؓ متفق علیہ) جس کا ایک مقصد راقم کے خیال میں یہ بھی ہے کہ امیر جماعت پر منکشف ہونے والے مستقبل کے حالات سے باخبر رہا جا سکے اور وقت آنے پر اُس کے حکم سے عذاب الٰہی کے ممکنہ علاقے سے ہجرت کی جا سکے۔

سورۃ اعراف میں بیان کئے گئے اصحاب سبت کے واقعہ کی روشنی میں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عذاب الٰہی سے وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو کامل مؤمن ہوں یعنی فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بخوبی انجام دیتے ہوں۔ جو لوگ یہ فریضہ اپنی امکانی حد تک انجام نہ دیتے ہوں، ان کے متعلق بھی غالب امکان یہی ہوتا ہے کہ وہ بھی ظالموں کے ساتھ ہی ہلاک ہوں جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَآصَّةً ج/وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ/ (۲۵)

''اور ڈرو اُس فتنہ (کے وبال) سے جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی لاحق نہیں ہوگا اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

المختصر فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا کرنے والی ''سمع وطاعت'' کی بیعت کی بنیاد پر قائم مسلمانوں کی کسی جماعتِ حق کے امیر کے متعلق اس بات کی قوی امید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اُن کارکنوں اور معتقدین کو عذاب الٰہی سے بچا لینے میں کامیاب ہو جائے گا جو سمع وطاعت کے خوگر ہوں یا اُس پر مکمل اعتبار رکھتے ہوں۔

بالفرض ایسا نہ بھی ہو تو قدرت الٰہی ایسے مومنین کو عذاب سے بچانے کا کوئی اور انتظام بھی کر سکتی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

تلاوت قرآن حکیم کے دوران ایک اور حقیقت میرے سامنے آئی کہ قرآن کریم میں بھی تین بار خسف کے عذاب سے متنبہ کیا گیا ہے۔ گویا مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے تین واقعات خسف کا تذکرہ قرآنِ مبین میں بھی ''بطور وعید'' موجود ہے۔

مزید برآں تلاوت و مطالعۂ قرآن بالخصوص قلب القرآن یعنی سورۃ یٰسین کے واقعہ اصحاب قریہ کے متعلق غور و خوض سے مزید حیرت انگیز باتیں مجھ پر منکشف ہوئیں جس سے کتاب ہذا کی انفرادیت و افادیت میں بہت حد تک اضافہ ہو گیا۔ ان انکشافات کا تفصیلی تذکرہ واقعہ اصحاب قریہ کی بحث میں کیا گیا ہے۔ اسی مضمون کو کتاب میں شامل نہ کرنے کا محترم بشیر احمد یوسفزئی صاحب نے مشورہ دیا تھا۔ میں نے جب اس معاملہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ اصحاب قریہ کے مضمون نے تو درحقیقت میری اس کتاب کی تکمیل کی ہے وگرنہ یہ ایک ادھوری کاوش ہوتی اور میرے اُس احساس فرض کی کما حقہ ادائیگی نہ ہو سکتی جس کے تحت میں نے اسے تالیف کیا ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ منفی اور مثبت کا ساتھ ہمیشہ سے رہا ہے اور یہ ایک ایسا اصول ہے جسے نقل (شریعت)، عقل اور سائنس سبھی تسلیم کرتے ہیں۔

کیا ہمارا کلمہ طیبہ بھی نفی اور اثبات پر مشتمل نہیں ہے؟

کیا وہ کہانی مکمل قرار دی جا سکتی ہے جس میں منفی کرداروں کا بیان تو ہو مگر اُن کرداروں کو چیلنج کرنے والے مثبت کرداروں کو حذف کر دیا جائے؟

کیا یہ راقم کا فرض نہیں بنتا کہ وہ اپنے قارئین کو عصرِ حاضر کے منفی کرداروں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مدمقابل جدوجہد کرنے والے مثبت کرداروں کے متعلق بھی آگہی دلائے؟

جب بھی دنیا میں فرعون، قارون، ہامان، سامری اور بلعم بن باعورہ ایسے منفی کردار موجود ہوں گے تو اُن کو چیلنج کرنے والے موسیٰؑ، ہارونؑ، یوشع بن نون، کالب بن یوحنا اور مردمومن کے سے مثبت کردار بھی ضرور موجود ہوں گے۔

ان کرداروں کی تلاش اور تعین اگرچہ ایک مشکل امر ہے مگر ناممکن اور ممنوع ہرگز نہیں ہے۔ ان کرداروں کے تعین میں اختلاف رائے بھی ضرور ہو سکتا ہے مگر یہ اختلاف مسلکی تعصّبات کی بجائے کچھ اصولوں و ضوابط کے تحت ہی ہونا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ واقعہ اصحاب قریہ کا امت مسلمہ کی موجودہ صورت حال پر منطبق ہونا اُمت کیلئے اتحاد، یگانگی اور وحدت کا پیغام ثابت ہوگا تو اُمت کو تقسیم کرنے والے قارونوں و فرعونوں کیلئے خدائی وارننگ۔

قارئین محسوس کریں گے کہ میں نے خسف بجزیرۃ العرب اور خسف بالمغرب کی نسبت خسف بالمشرق کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

(۱) باقی دو خسوف کی نسبت اس کا تعین زیادہ مشکل تھا، اس لئے بحث طویل ہو گئی۔

(۲) خسف بالمشرق کاتعلق ہمارے اپنے ملک پاکستان سے ہے لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اپنے ہم وطنوں کے لئے حقائق تفصیلاً بیان کئے جائیں۔

(۳) زمین کے تین خسوف کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے عالمگیر اثرات میں سے اہم ترین اور اولین حیثیت خسف بالمشرق کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے اثرات وانقلابات کو حاصل ہوگی لہٰذا اس کا تذکرہ اور اثرات قدرے تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں جن سے قارئین کو عبرت وموعظت کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لئے روشنی کی کرن بھی واضح طور پر دکھائی دے گی۔اوراس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مستقبل کے روشن امکانات افراد واقوام کے لئے پیغامِ حیات ثابت ہوا کرتے ہیں جبکہ ناامیدی انسان کو ابلیس لعین کی طرح اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے پروردگار کی نافرمانی میں اس قدر دلیر وجری ہوجاتا ہے کہ بالآخر اپنا مستقل ٹھکانہ جہنم میں بنالیتا ہے اور یقیناً اس سے براٹھکانہ اور کوئی نہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ یَا مُجِیرُ یَا مُجِیرُ یَا مُجِیرُo

کتاب ہذا کی ایک اہم خوبی بقول ناظمِ تربیت جناب شاہد اسلم صاحب،اس کا آسان اردو زبان میں تحریر ہونا ہے۔اگرچہ اہلِ ادب کے نزدیک یہ خوبی کی بجائے خامی ہی شمار ہوگی جس کی بڑی وجہ راقم کی کوتاہ علمی کے ساتھ ساتھ اپنی کتاب کو عام فہم بنانے کی خواہش بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ آسان اردو میں لکھی جانے والی اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں گے اوراس طرح کتاب ہذا کے ذریعے ابلاغ کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہوسکے گا۔

محترم مبارک گلزار صاحب کے تعاون سے کتاب کی کمپوزنگ جاری تھی کہ ۸،اکتوبر ۲۰۰۵ کو پاکستان تاریخ کے شدید ترین وبدترین زلزلہ کا شکار ہوگیا۔اس زلزلہ نے جہاں ایک طرف میری کتاب کے موضوع کو مزید تقویت واہمیت عطا کردی تو دوسری طرف اس کتاب پر نظر ثانی کی ضرورت بھی ناگزیر بناڈالی۔

میں نے اس ٹائپ شدہ مسودہ کو مطالعہ وتبصرہ کیلئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی خدمت میں پیش کیا اور خود کتاب پر نظر ثانی میں مصروف ہوگیا۔ایک عرصہ کے بعد پتہ کیا تو انہوں نے اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے سے گریز کیا جس کی وجہ غالباً یہی محسوس ہوئی کہ اس میں انکی شخصیت وکردار کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اپنے متعلق رائے زنی کرنا انہوں نے مناسب نہ سمجھا ہوگا۔(واللہ اعلم)

المختصر نظر ثانی کے عمل کے آغاز سے لے کر کتاب کے اس موجودہ حالت تک پہنچنے میں مزید طویل عرصہ بیت گیا اور اب یہ کتاب قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش کی جارہی ہے کہ وہ اس میں بیان کی گئی (اُن کے نقطہ نظر کے مطابق) مثبت باتوں پر ہی متوجہ ہوں گے اور (انکے نکتہ نظر کے مطابق) اسکے منفی پہلوؤں نظرانداز کردیں گے۔

راقم کتاب ھذا کی تکمیل کیلئے تعاون کرنے والے حضرات بالخصوص ڈاکٹر غلام مرتضےٰ ، جناب عاطف وحید صاحب، حافظ محمد زبیر صاحب اور جناب مبارک گلزار صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

وماتوفیقی الا بااللہ العلی العظیم .

(باب اول)

قیامت، علاماتِ قیامت اور عذابِ خسف

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات میں سے سب سے یقینی اور قطعی معاملہ قیامِ قیامت کا ہے۔ قرآن حکیم میں قیامت کو **السَّاعَةُ، الوَاقِعَةُ، القَارِعَةُ، اور الحَاقَّة** وغیرہ بہت سے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔

قیامِ قیامت پر ایمان اسلام کا جزوِ لازم ہے اور اس کا منکر بلاشبہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ قیامت کیا ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات اگرچہ تفصیل طلب ہیں مگر ان موضوعات پر کتاب ہذا میں زیادہ بحث نہیں کی جاسکتی جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر قارئین ان سوالات کی حقیقت سے واقف ہی ہوں گے۔

تاہم مختصر ترین الفاظ میں ان دونوں سوالات کا جواب پیش کیا جارہا ہے:

قیامت سے مراد

اس موجودہ عالم کا خاتمہ ہے اور اس عالم سے مراد اکثریت کے خیال میں پوری کائنات ہے جبکہ بعض لوگوں کے خیال میں قیامت کا دائرۂ کار صرف ہمارے نظامِ شمسی تک ہی وسیع ہوگا اور بعض کے خیال میں اس سے مراد صرف یہ کرۂ ارض ہے جس پر ہم بستے ہیں۔ گویا اس کرۂ ارض کی تباہی یا خاتمے پر سب ہی متفق ہیں۔ میرے خیال میں ان تمام نقطۂ ہائے نظر کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اگر ہم صرف قیامِ قیامت کے مقصد کو ہی مقدم رکھیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں۔

قیامِ قیامت کا مقصد

اس موجودہ عالم کا خاتمہ ہے جس میں صرف مادی قوانین ہی عملی حیثیت رکھتے ہیں تاکہ ایک نئے عالم کی تخلیق کرکے اخلاقی قوانین کو عملی حیثیت دی جاسکے۔ چونکہ موجودہ مادی دنیا میں انسان کو بغرضِ امتحان بھیجا گیا ہے اور یہ امتحان اخلاقی قوانین (تعلیمات وحیٔ الٰہی) پر عمل کرنا ہے لہٰذا جو انسان موجودہ مادی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اپنے پیغمبروں کی طرف بھیجی جانے والی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرے گا، وہ قیامت کے نتیجہ میں قائم ہونے والے نئے عالم (عالمِ آخرت) میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مستحق قرار پائے گا اور جو الہامی تعلیمات کو پسِ پُشت ڈال کر صرف مادی قوانین اور محض اپنی عقل سے تراشیدہ اصولوں کے مطابق ہی زندگی بسر کرنے پر اصرار کرے گا، وہ عالمِ آخرت میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کے انعامات سے محروم رہے گا بلکہ اس کے برعکس اپنے اعمالِ بد کی سزا بھی ضرور حاصل کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو علم اور اختیارات عطا کئے ہیں وہ غیر محدود نہیں ہیں اور اس حد کا علم بھی ہمیں نہیں دیا گیا ہے۔ انسان چاہے کتنی ہی کہکشائیں دریافت کرلے، کتنے ہی ستاروں پر کمندیں ڈال لے اور کتنی ہی ترقی کرلے، وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی دسترس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اسے اپنی موجودہ زندگی کا حساب و کتاب اللہ کے ہاں عالمِ آخرت میں پیش ہوکر دینا ہی پڑے گا خواہ وہ کسی اور سیارے پر ہی جا بسے جہاں کے طبعی قوانین اس کرۂ ارض کے قوانین سے بالکل مختلف ہوں۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ

(۳۳) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳٤) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (۳۵)

۱۱ اے گروہِ جن وانس! اگر تمہارے بس میں ہے کہ تم آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے بھاگ جاؤ تو بھاگ کر دیکھ لو۔ تم نہیں بھاگ سکتے مگر اس کے لئے بڑا زور چاہئے۔ پس تم اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے (اگر تم ایسا کرنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ چھوڑا جائے گا اور دھواں (بھی)، پھر تم ان کا مقابلہ نہ کرسکو گے۔ ۱۱ (الرحمٰن ۳۵۔۳۳)

پس قیامت کا مقصد جنوں اور انسانوں کو عطا کی گئی زندگی کا حساب لینا ہے جو انہیں بطورِ امانت دی گئی ہے لہٰذا یہ دونوں مخلوقات کائنات کی کسی بھی وسعت میں جا پہنچیں، وہ ذاتِ باری تعالیٰ کو عاجز نہیں کرسکتیں اور اپنے اُخروی محاسبہ سے بھی نہیں بچ سکتیں۔

تاہم یہ قیامت کب قائم ہوگی؟ اس کا حتمی علم بھی انسان کو عطا نہیں کیا گیا۔ قیامِ قیامت کے حتمی وقت کا علم اس کے برپا کرنے والی ذاتِ باری تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ذریعے ہمیں قربِ قیامت کی علامات سے ضرور آگاہ کیا ہے۔ قربِ قیامت کی ان علامات کو دو اقسام میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) علاماتِ صُغریٰ (۲) علاماتِ کُبریٰ

علاماتِ صُغریٰ

سے مراد سماجی رویوں، معاشرتی اقدار اور تہذیب و تمدن میں ہونے والی وہ تبدیلیاں ہیں جو قربِ قیامت پر دلالت کرتی ہیں مثلاً کثرتِ شراب نوشی، اولاد کا نافرمان ہونا، آلاتِ موسیقی وغیرہ

کی کثرت،لوگوں کا مساجد کی زیب وزینت پر فخر کرنا،کسی زمانے میں مفلوک الحال رہنے والے چرواہوں کا بلند سے بلند تر عمارتیں تعمیر کرنے کی کوششیں کرنا وغیرہ۔اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ درج بالا علاماتِ صُغریٰ اور احادیث میں وارد ہونے والی دیگر علامات اکثر و بیشتر ظاہر ہو چکی ہیں۔گویا ہم قربِ قیامت کے زمانہ میں جی رہے ہیں۔

علاماتِ کُبریٰ

سے مراد وہ بڑے بڑے واقعات ہیں جو قیامت سے قبل رونما ہوں گے مثلاً ظہورِ حضرت مہدی،"الملحمة العُظمی"،یعنی عظیم ترین جنگ،خروجِ دجّال اور طلوعِ آفتاب من المغرب وغیرہ۔ان علاماتِ کُبریٰ میں سے مشہور ترین اور اہم ترین وہ دس علامات ہیں جو درج ذیل حدیث میں بیان کی گئی ہیں:

عن حذ یفته بن اسید الغفا ریؓ قال : ا طلع رسول الله ﷺ علینا ونحن نتذاکر، فقا ل: ماتذا کر ون ؟ قلنا : (نذکر) السا عة. قال :انها لن تقو م حتی تر وا قبلها عشر آیات ، فذ کر الد خا ن ، وا لد جا ل، وا لد ابة ، وطلو ع الشمس من مغر بها ، ونزول عیسی بن مر یم ویا جو ج وما جو ج وثلا ثة خسوف : خسف با لمشر ق ، و خسف با لمغر ب ، وخسف بجزیر ة العر ب ، وآخر ذلک : نا ر تطر د النا س الی محشر هم . (روا ه مسلم وا بو داو د و الترمذی)

" حضرت حذیفہ بن اسید الغفاری سے روایت ہے،انہوں نے فرمایا ! رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم باتیں کر رہے تھے۔پس آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ ہم نے جواب دیا کہ ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا! وہ (قیامت) ہرگز قائم نہیں ہو گی یہاں تک کہ تم اُس سے قبل دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔پس آپ ﷺ نے ذکر کیا دھوئیں کا،دجال کا،جانور کا،مشرق سے طلوع آفتاب کا،عیسی بن مریمؑ کے نزول کا اور یاجوج و ماجوج (کے خروج) کا اور تین خسوف کا (یعنی) مشرق،مغرب اور جزیرۃ العرب (میں زمین دھنس جانے کے واقعات) کا اور سب سے آخر میں اُس آگ کا جو لوگوں کو ہانک کر میدان حشر کی طرف لے جائے گی۔"

ان دس عظیم علامات کی نوعیت پر غور کرنے سے ان کی نمایاں مشترک خصوصیت یہ ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے ظہور کے نتیجہ میں کرۂ ارض پر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوں گے لہٰذا ہر علامت کے ظاہر ہونے پر اس دنیا میں انقلابات و تبدیلیوں کی لہریں اٹھیں گی مثلاً دجّال کے متعلق سبھی جانتے ہیں کہ اس کا فتنہ عالمگیر ہوگا اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کی حکومت پوری روئے زمین پر قائم ہو گی۔اسی طرح طلوع آفتاب من المغرب کا واقعہ تو ہمارے نظامِ شمسی کا اہم ترین واقعہ ہوگا۔امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔اِس تناظر میں غور کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کے خاتمے سے قبل ان دس عظیم علامات کا ظہور کس قدر عالمگیر تبدیلیوں و اثرات کا حامل ثابت ہوگا۔

عذابِ خسف اور زمین کے تین خسوف:

چونکہ ہمارا موضوع بحث صرف زمین کے تین خسوف ہیں لہٰذا سب سے پہلے ہم اس کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

خسوف دراصل خسف کی جمع ہے جس کا مطلب ہے "کسی چیز کا پست ہو کر اندر کی طرف یا نیچے کی جانب دھنس جانا۔"

پس زمین کے تین خسوف کا مطلب تین مختلف جگہوں سے زمین کا پست ہو کر نیچے کی جانب دھنس جانا ہوا۔لہٰذا مستقبل میں مشرق،مغرب اور جزیرۃ العرب میں پیش آنے والے ایسے واقعات جن کے نتیجہ میں زمین پست ہو کر نیچے کی جانب دھنس جائے گی،زمین کے تین خسوف کہلاتے ہیں۔

زمین کے یہ تین خسوف بڑے پیمانہ پر تباہی و بربادی کا باعث بنیں گے اور انہیں اُن چھوٹے موٹے واقعات پر منطبق نہیں کیا جا سکتا جو ماضی میں رونما ہو چکے ہیں اور یا پھر رونما ہو سکتے ہیں۔سلف میں سے بعض حضرات کی رائے بھی یہی ہے مثلاً شمس الحق عظیم آبادیؒ نے ابوداؤد کی شرح "عون المعبود" میں لکھا ہے کہ ابن الملکؒ نے ان تین خسوف کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اا ان سے مراد وہ خسوف نہیں ہے جو کہ پہلے کئی جگہ واقع ہو چکے ہیں کیونکہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ خسوف بڑے پیمانہ پر واقع ہوں گے اور بڑی تباہی لائیں گے۔اا

عام طور پر زمین کے تین خسوف کے ان واقعات کو قیامت کی آخری علاماتِ کُبریٰ میں سے خیال کیا جاتا ہے۔مثلاً امین جمال الدین کی کتاب،'اُمت مسلمہ کی عمر'، میں انہیں مومنوں کو نظر نہ آنے والی علامات' کے عنوان سے وقوع قیامت سے متصلاً قبل کے واقعات کے طور پر بیان کیا گیا ہے حالانکہ بعض روایات میں (مثلاً طبرانی،حاکم،ابن مردویہ اور کنز العمال میں حضرت واثلہؓ کی روایت) زمین کے ان تین خسوف کو اولین علاماتِ کُبریٰ کے طور پر بھی بیان کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ علامات کی یہ ترتیب حتمی نہیں ہے اور یہ کہ ان دس علاماتِ کُبریٰ کی ترتیب بلحاظِ ظہور میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

راقم کے خیال میں قیامت کی علاماتِ کُبریٰ بالخصوص دس عظیم علامات کا باقاعدہ آغاز زمین کے تین خسوف سے ہی ہوگا - اور ان تینوں واقعاتِ خسف کے بعد ہی پے بہ پے مزید ایسے عظیم واقعات رونما ہوں گے جو قربِ قیامت کا مظہر ہوں گے مثلاً ظہور مہدی اور خروج دجال وغیرہ۔

اگر چہ حضرت مہدی کا ظہور بھی دس عظیم علاماتِ کبریٰ کی طرح عالمگیر اثرات و انقلابات کا حامل ہوگا تاہم میرے خیال میں نبی کریمؐ نے زمین کے تین خسوف کو ظہور مہدی کے قائم مقا

م کے طور پر بیان کیا ہے کیونکہ یہی تین واقعاتِ خسف درحقیقت ظہورِ حضرت مہدی کی راہ ہموار کریں گے۔ درج ذیل حدیث مبارکہ میرے اس خیال کی تائید کرتی ہے:

اا حضرت ابوسعید خدریؓ، رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا! میں تمہیں مہدی کی بشارت دیتا ہوں جو ایسے زمانہ میں ظاہر ہوں گے جبکہ لوگوں میں بڑا اختلاف ہوگا اور بہت زلزلے آئیں گے۔ پس وہ زمین کو اُسی طرح عدل وقسط سے بھر دیں گے جیسا کہ وہ اُنکی آمد سے قبل ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔اا (رواہ احمد وابویعلی)

درج بالا روایت سے معلوم ہوا کہ ظہور حضرت مہدی سے قبل بکثرت زلزلے آئیں گے اور ظاہر بات ہے کہ زمین دھنس جانے کے واقعات یعنی زمین کے تین خسوف زمینی جُنبش یعنی زلزلوں کے نتیجہ میں ہی وقوع پزیر ہوں گے۔ (اس روایت میں جس اختلاف کا ذکر کیا گیا ہے، اُس پر انشاءاللہ آگے اظہار خیال کیا جائے گا)

ترمذی شریف کی بھی ایک روایت میری اس رائے کی تصدیق کرتی ہے کہ زمین کے تین خسوف کا تعلق اولین علامات کبریٰ سے ہے نہ کہ بالکل آخری علامات سے۔ اس حدیث مبارکہ کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں جبکہ اسی سے ملتی جلتی روایت ترمذی شریف میں ہی حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے۔ یہ دونوں روایات اگرچہ ضعیف خیال کی جاتی ہیں تاہم اس سے ملتی جلتی متعدد دیگر روایات ان کے ضعف کو بہت حد تک کم کر دیتی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا مفہوم

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اا جب مالِ غنیمت گردش کرنے لگا اور جب مالِ امانت کو مالِ غنیمت سمجھ کر ہڑپ کیا جائے گا جبکہ زکوٰۃ کو تاوان خیال کیا جائے گا، علم (دین کی بجائے) دنیا حاصل کرنے کیلئے سیکھا جائے گا، جب آدمی اپنی بیوی کا کہا مانے گا اور ماں کی نافرمانی کرے گا، جب وہ اپنے دوست سے حسنِ سلوک کرے گا اور اپنے باپ سے بدسلوکی، جب مسجد میں شور بلند ہوگا، جب قوم کا رہنما ذلیل ترین آدمی ہوگا اور بدکار قبیلے کا سردار بن جائے گا، جب انسان کی عزت اس کے شر کے ڈر سے ہوگی، جب شراب پی جائے گی اور ریشم پہنا جائے گا، جب گانے والیوں اور آلات موسیقی کا چرچا ہوگا اور جب اس امت کے آخری لوگ پہلوں پر لعنت کریں گے تو اُس زمانے میں سرخ آندھیوں، زلزلوں، زمین کے دھنسنے، شکلوں کے مسخ ہونے اور پتھروں کی بارش (کے عذاب) کے منتظر رہو اور (ان کے ساتھ دوسری اور نشانیوں کا بھی) انتظار کرو جو پے بہ پے اس طرح ظاہر ہوں گی جیسے موتیوں کی ایک لڑی کا دھاگہ ٹوٹ چکا ہو اور موتی پے بہ پے گر رہے ہوں۔اا

درج بالا روایت میں ٹوٹنے والی لڑی سے گرنے والے موتیوں سے مراد قیامت کی علاماتِ کبریٰ ہیں جو پانچ مختلف قسم کے عذاب ہائے الٰہی کے نزول کے بعد بالترتیب ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی جبکہ اس کے اوپر بیان کی گئی علامات کو علاماتِ صغریٰ میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس روایت سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ علامات کبریٰ کا آغاز پانچ مختلف قسم کے عذاب ہائے الٰہی کی شکل میں ہوگا جن میں خسف (دھنس جانے) کا عذاب بھی شامل ہے۔

ان میں سے عذابِ خسف خصوصی اہمیت کا حامل اور توجہ طلب ہے۔ چونکہ یہ کُرہ ارض کے تین مختلف علاقوں پر نازل ہوگا لہٰذا اسے ان پانچ عذاب ہائے الٰہی میں سے سب سے بڑا عذاب (عذاب اکبر) قرار دیا جاسکتا ہے اور غالباً ان میں سے سب سے آخر میں نازل ہونے والا عذاب یہی ہوگا۔ زمین کے تین خسوف کو عذاب اکبر یا عذاب ہلاکت اس اعتبار سے قرار دیا جاسکتا ہے کہ جن خطوں پر یہ عذاب نازل ہوگا، وہاں مکمل تباہی وبربادی کا سامان لے کر آئے گا اور وہاں شاید ہی کوئی ذی روح زندہ بچ سکے جیسا کہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے:

"حضرت عبدالرحمٰن بن صحار عبدیؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ اُن کے باپ نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ! قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ بعض قبیلے زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے اور لوگ پوچھیں گے کہ فلاں قبیلے سے کوئی زندہ بچا ہے؟اا (رواہ احمد)

پس اس عذاب خسف کی وجوہات اور اُن تین علاقوں کا آثار وقرائن کی روشنی میں تعین نہائت ضروری معلوم ہوتا ہے اور اسی کے لئے راقم نے بفضل خدا یہ کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے۔

عذاب الٰہی کی اقسام

عذاب الٰہی دو اقسام کا ہوا کرتا ہے: (۱) عذابِ استیصال (۲) عذابِ ادنیٰ

عذابِ استیصال

اسے قرآن کریم میں عذابِ اکبر کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ عذاب صرف اُن اقوام پر نازل ہوتا ہے جن کی طرف اللہ کے رسول معبوث ہو کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر چکے ہوں۔ اس عذاب کے نتیجہ میں صرف رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا کر باقی پوری کی پوری قوم کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے یعنی انہیں مکمل نیست ونابود کر دیا جاتا ہے۔ قوم نوحؑ، قوم عاد وثمود، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ اس کی نمایاں مثالیں ہیں جو اپنے اپنے دور میں مکمل طور پر عذاب الٰہی کا شکار ہو کر نسیاً منسیاً ہوگئیں۔

عذابِ ادنیٰ

عذابِ ادنیٰ سے مراد وہ ہلکا عذاب ہے جو فسق و فجور میں مبتلا اقوام پر ''بطور تنبیہ'' نازل ہوا کرتا ہے تا کہ وہ اپنی بداعمالیوں سے باز آ جائیں۔اس کی مثالیں آلِ فرعون پر نازل ہونے والے سات مختلف قسم کے عذاب جو غرقِ فرعون سے پہلے نازل ہوئے، قارون پر نازل ہونے والا عذابِ خسف اور اصحابِ سبت پر نازل ہونے والا عذابِ مسخ وغیرہ قرار دی جا سکتی ہے۔

جہاں تک عذابِ اکبر یعنی عذابِ استیصال کا تعلق ہے تو وہ اب سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور پر نازل نہیں ہوگا (اور یہ اس طرح سے ہوگا کہ نزولِ حضرت عیسیٰؑ کے بعد اسلام قبول نہ کرنے والے ہر یہودی کو قتل کر دیا جائے گا) کیونکہ آنحضورؐ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔البتہ عذابِ ادنیٰ کے دروازے اب بھی کھلے ہیں اور حضور اکرمؐ کی مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں ۲۰۰۴ء کے سونامی اور پاکستان کے حالیہ زلزلہ (اکتوبر ۲۰۰۵ء) کے تناظر میں مستقبل قریب میں اس کے نزول کے امکانات واضح نظر آ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عذابِ الٰہی اُسی وقت نازل ہوتا ہے جب ظلم و ستم اور فسق و فجور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقررہ ایک حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وقوعِ قیامت سے پہلے دو ادوار ایسے آئیں گے جن میں ظلم و ستم اور فسق و فجور کا غلبہ حد سے زیادہ ہو چکا ہوگا اور فساد فی الارض کی بھی انتہا ہو چکی ہوگی۔یہ دو ادوار مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ظہورِ حضرت مہدیؑ سے متصلاً قبل کا دور

(۲) وقوعِ قیامت سے متصلاً قبل کا دور

ظہورِ مہدی سے متصلاً قبل کا دور

جہاں تک ظہورِ مہدی سے متصلاً قبل کے دور کا تعلق ہے تو اس کے ظلم و ستم سے بھرپور ہونے کی خبر رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے:

۱۱ یملا الارض قسطا و عدلا کما ملئت ظلما و جورا ۱۱

(عن ابی سعید الخدریؓ رواہ ابو داؤد)

۱۱ حضرت مہدی کرۂ ارض کو اُسی طرح عدل و قسط سے بھر دیں گے جیسے وہ اس سے پہلے ظلم و ستم سے بھر چکی ہوگی۔۱۱

اور یہ بات تو ہم جانتے ہی ہیں کہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین فتنہ یعنی ''فتنہ دجّالِ اکبر'' حضرت مہدیؑ کے دور میں ہی ظاہر ہوگا تاہم اس فتنہ کی تمہید اور اس کے ظہور کے لئے سازگار ماحول تو یقیناً حضرت مہدیؑ کے ظہور سے پہلے ہی پیدا ہو چکا ہوگا جسے بعض حضرات بجا طور پر ''دجالی تہذیب'' کا نام بھی دیتے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورۃ الکہف (جسے حضور ﷺ نے دجالی فتنہ سے محفوظ رہنے کیلئے ایک مؤثر ہتھیار قرار دیا ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دجالی تہذیب دراصل اس دنیائے فانی کی چمک دمک اور زیب و زینت میں کھو جانے، مادہ پرستی کے شرک میں مبتلا ہو جانے، انکارِ آخرت یا فکرِ آخرت کو فراموش کر دینے اور احکاماتِ وحیٔ الٰہی سے انکار و انحراف کے رویوں و اصولوں پر قائم ہونے والی تہذیب ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ تہذیب اس وقت تقریباً پورے کرہ ارض پر ہی چھا چکی ہے۔

اس تہذیب کے دلدادہ افراد کا سب سے بڑا مسئلہ اُن کا معاشی فتنہ میں مبتلا ہونا ہے۔

راقم کے خیال میں زمین کے تین خسوف اس دجالی تہذیب پر کاری ضربیں لگانے، اسکے خلاف برسرِ پیکار مومنین کی نصرت فرمانے اور باقی نوعِ انسانی کو اس سے توبہ کا موقع فراہم کرنے کے لئے وقوع پذیر ہوں گے۔لہٰذا ظہورِ مہدیؑ سے قبل زمین کے تین خسوف زیادہ قرین قیاس اور حکمت سے بھرپور قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

وقوعِ قیامت سے متصلاً قبل کا دور

وقوعِ قیامت کے بالکل نزدیک کے احوال جو روایات میں بیان کئے گئے ہیں، اس طرح سے ہیں کہ جب آفتاب کا مغرب سے طلوع ہوگا تو 'درِ توبہ' ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد 'دابۃ الارض' کا ظہور ہوگا۔یہ عجیب و غریب جانور روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی پیشانیوں پر ایمان یا کفر کی مہر لگا دے گا۔اس کے بعد آسمان میں ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہوگا جو کافروں کے لئے ایک دردناک سزا اور مومنوں کے لئے معمولی تکلیف کا باعث ہوگا۔اس کے بعد ایک نرم ریشم جیسی ہوا چلے گی جو تمام اہلِ ایمان کی اروح قبض کر لے گی۔اب صرف کافر و فاسق لوگ ہی بچیں گے جن پر زلزلۂ قیامت کا عظیم ترین عذاب نازل ہوگا اور یہ وہ وقت ہوگا جب نہ صرف یہ کرۂ ارض بلکہ پوری کائنات کا نظام درہم برہم کر دیا جائے گا۔لہٰذا اُس موقع پر زمین کے تین خسوف بالکل عبث اور بعید از حکمت معلوم ہوتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی عمل بے مقصد اور خالی از حکمت نہیں ہوا کرتا کیونکہ اُس وقت تو اس کرۂ ارض اور کائنات کو ''پہلا صور'' پھونک کر مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا جائے گا اور پھر ''دوسرا صور'' پھونک کر اسے بالکل نئی اور پہلے سے مختلف شکل دے دی جائے گی۔

مزید برآں نبی کریمؐ کی یہ احادیث کہ 'قیامت تو صرف بدکاروں پر ہی واقع ہوگی' (عن عبداللہ بن مسعودؓ رواہ مسلم) اور یہ کہ 'قیامت قائم نہ ہوگی اُس وقت تک جب تک زمین پر اللہ اللہ کہا جاتا رہے گا' (عن انس بن مالکؓ رواہ مسلم ترمذی) بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔اگر زمین کے تین خسوف کو زلزلۂ قیامت کا حصہ یا اُس کا نتیجہ مان لیا جائے تو اس اصول کی نفی ہو جاتی ہے کہ قیامت تو صرف بدکاروں پر ہی آئے گی کیونکہ نہ تو زمین کے تین خسوف کا نشانہ بننے والے علاقوں میں اہل ایمان بالکل ختم ہو جائیں گے اور نہ ہی بدکار لوگ صرف ان تین علاقوں میں ہی محدود ہوں گے۔

زلزلۂ قیامت سے کوئی مومن ہلاک نہ ہوگا جبکہ زمین کے تین خسوف کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والوں میں اہلِ ایمان (خواہ کم درجہ کے اھل ایمان ہی ہوں) بھی شامل ہو سکتے ہیں۔اگر زمین کے تین خسوف قیامت سے متصلاً قبل وقوع پزیر ہوں تو اُس وقت یہ کسی کے لئے باعث عبرت ثابت ہوں گے اور نہ ہی باعثِ نُصرت۔

قرآن کریم کی درج ذیل آیت بھی اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ قیامت سے قبل مختلف بستیوں پر ان کے اعمال کی پاداش میں عذاب ہائے الٰہی نازل ہوں گے:

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ/ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ط كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا

(۵۸)

'' اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کر دیں گے یا شدید عذاب سے دوچار نہ کریں گے۔ یہ بات کتاب (لوحِ محفوظ) میں لکھی جا چکی ہے۔،، (بنی اسرائیل ۵۸)

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جو بستیاں اطاعتِ خداوندی اختیار نہیں کریں گی انہیں قیامت سے پہلے ہلاک کر دیا جائے گا یا پھر شدید عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔

عذاب الٰہی کی نوعتیں

عذاب الٰہی اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین بنیادی اقسام پر مشتمل ہوتا ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں بیان ہوا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ/ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ/ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا/ وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط/ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ/ (٦٥)

ا ا آپ ﷺ کہہ دیجئے! وہ (اللہ) اس پر قدرت رکھتا ہے کہ عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے (یعنی آسمان سے) اور تمہارے پاؤں کے نیچے سے (یعنی زمین کے اندر سے) یا پھر بھڑا دے تمھیں فرقہ فرقہ کر کے (آپس میں) اور (اس طرح) چکھاوے مزہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا۔ دیکھو! کس طرح بار بار پیش کرتے ہیں ہم اپنی آیات تا کہ وہ سمجھ جائیں۔" (سورۃ الانعام ٦٥)

ان آیات سے ثابت ہوا کہ ارضی وسماوی آفات کے علاوہ فتنہ اور فساد بھی دراصل عذاب الٰہی کی ہی ایک قسم ہے۔ یعنی عذاب الٰہی زلزلے، خسف، مسخ، سرخ آندھی اور سنگ باری کے علاوہ دیگر قدرتی آفات، دشمن کے غلبہ، فتنہ وفساد، خانہ جنگی اور طوائف الملوکی (بدامنی) کی صورتوں میں بھی ہو سکتا ہے۔

عذاب الٰہی کا مقصد

ان تمام اقسام کے عذاب ہائے الٰہی کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والوں کا فیصلہ تو روزِ قیامت کو ان کے اعمال کے مطابق ہی ہوگا تاہم اس سے محفوظ رہنے والوں کے لئے یہ عذاب عبرت کا سامان ہوا کرتا ہے۔ اب جو چاہے عبرت حاصل کرے اور جو چاہے کفر پر ہی اڑا رہے جیسا کہ درج ذیل آیات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى/ دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ/ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (٢١) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ/ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ط/ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ/ (٢٢)

ا ا اور ہم ضرور مزہ چکھائیں گے ان (بدکاروں) کو عذابِ ادنیٰ (دنیا کے چھوٹے عذاب) کا (قیامت کے) بڑے عذاب سے قبل شاید وہ باز آجائیں (اپنی بداعمالیوں سے) اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جسے اس کے پروردگار کی نشانیوں کے ذریعے یاددہانی کرائی جائے اور پھر بھی وہ ان سے منہ پھیرے؟ یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لے کر رہیں گے۔ ا ا

(سورۃ السجدہ ۲۲۔۲۱)

یہاں اللہ کی نشانیوں سے مراد ماضی کے وہ آثارِ عذاب یا مستقبل کے وہ قرائن عذاب اور انکے ممکنہ نتائج وعواقب ہیں جن کے ذریعے افراد یا اقوام کو عبرت دلائی جاتی ہے اور توبہ کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۲٦ اسی اَمر پر دلالت کرتی ہے:

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ/ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ/ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ط/ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ط/ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ

(٢٦)

'' کیا ان (مجرموں) کو اس (بات) سے رہنمائی نہیں ملی کہ کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کیا ان سے پہلے اور یہ (لوگ) ان کی (تباہ حال) بستیوں میں چلتے پھرتے (بھی) ہیں۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں (عبرت کے لئے) تو کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟''

بنی اسرائیل کے ایک گروہ (اصحاب سبت) پر نازل ہونے والے عذاب مسخ کا مقصد قرآن حکیم میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا/وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (٦٦)

اا پس ہم نے اس (واقعۂ مسخ) کو اُس وقت موجود اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے عبرت کا سامان اور (اللہ کا) خوف رکھنے والوں کے لئے نصیحت آمیز بنا دیا۔اا (البقرہ ٦٦)

پس قیامت سے پہلے قیامت کے مصداق زمین کے تین خسوف کے ذریعے قیامتِ صُغریٰ کے واقعات برپا کرنے کا مقصد اس دنیا کے عذابِ اکبر یعنی زلزلۂ قیامت اور اُس کے نتیجہ میں قائم ہونے والے یومِ حساب کے متعلق خبر دار کرنا ہوگا جس کے بارے میں ظہورِ مہدیؒ سے قبل کے دور کا مادہ پرست انسان اپنے کفر یا فسق کی وجہ سے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو چکا ہوگا تا کہ اُسے قیامِ قیامت کے برحق وممکن العمل ہونے پر پختہ ایمان لانے کی ترغیب دی جاسکے۔

اس حقیقت کی تصدیق نبی اکرمؐ کی درج ذیل مشہور حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ اُمت مسلمہ پر مختلف قسم کے عذاب ہائے الٰہی نازل ہوں گے:

''لَيَاتِين علٰى اُمَّتِي مَا اَتٰى علٰى بنى اسرائيل حذو النعل بالنعل.'' (عن عبدالله بن عمرؓ ابن العاص رواه ترمذی)

اا یعنی میری امت پر بھی لازماً وہ تمام احوال وارد کررہیں گے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے بالکل ایسے ہو بہو جیسے (ایک جوڑے کی) ایک جوتی دوسری جوتی کے مشابہ ہوتی ہے۔اا

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ اُمتِ محمدؐیہ کو بھی اُن تمام اقسام کے حالات سے سابقہ پیش آئے گا جو سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے۔اگر چہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُمتِ محمدؐیہ کا انجام اور مجموعی طرزِ عمل بھی بالکل بنی اسرائیل جیسا ہی ہوگا۔

نبی آخرالزماںؐ کی یہ امت آخری امت ہے لہٰذا اس کا مجموعی طرزِ عمل اور انجام تو بنی اسرائیل سے کہیں بہتر ہوگا تاہم اس پر بھی وہ تمام احوال ضرور وارد ہوں گے جن سے بنی اسرائیل کو سابقہ پیش آیا تھا۔دونوں امتوں پر ایک جیسے حالات وارد کرنے کا مقصد راقم کے خیال میں اُمتِ محمدؐیہ کی بنی اسرائیل پر فضیلت ثابت کرنا ہی ہوگا۔

اس تناظر میں اگر تاریخ بنی اسرائیل کا مطالعہ کریں تو بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ موجودہ اُمتِ مسلمہ کے کچھ گروہوں کو بھی خسف' مسخ اور سرخ آندھیوں وغیرہ کے عذاب ہائے الٰہی کا مزہ چکھنا ہوگا جس طرح بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے قارون کو خسف اور اصحابِ سبت کو مسخ کے عذاب سے دوچار کرکے دوسروں کے لئے باعثِ عبرت بنایا گیا تھا۔

اسی اصول کو مدِّ نظر رکھا جائے تو بنی اسرائیل کی طرح اُمتِ مسلمہ بھی یقیناً کسی فرعونی قوت کی غلامی میں گرفتار ہو کر اُنہی حالات سے دوچار ہوگی جن سے بنی اسرائیل کو فرعونِ مصر کی غلامی کے دوران سابقہ پیش آیا تھا۔

چونکہ ہمارا موضوعِ بحث خسف کا عذاب ہے جو فرعونِ مصر کے اہم دست وبازو یعنی قارون پر نازل ہوا تھا لہٰذا ہم اگلے باب میں قارون اور اس کے فرعون کے ساتھ تعلق کے بارے میں قدرے تفصیلاً بحث کریں گے۔

(باب دوم)

قصۂ قارون وفرعون اور فتنۂ قارونیت وفرعونیت

قصہء قارون وفرعون کے اس باب کے متعلق راقم پہلے ہی عرض کر دینا چاہتا ہے کہ یہ باب قارون وفرعون کے قصوں کو روایتی انداز میں بیان کرنے کے لئے قائم نہیں کیا گیا بلکہ قارون اور فرعون کے کرداروں کی حقیقت قارئین پر واضح کرنے کے لئے اسے علیحدہ باب کی شکل دے کر فتنۂ قارونیت وفتنۂ فرعونیت کی حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم کے خیال میں قصہء فرعون اور فتنۂ فرعونیت کی نسبت قصہء قارون اور فتنۂ قارونیت کی حقیقت نمایاں کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ جو باتیں عہد نامہ قدیم (تورات) کی روشنی میں بالعموم بیان کی جاتی ہیں، قرآن کریم کے مطالعہ کی روشنی میں اس کے بالکل خلاف دکھائی دیتی ہیں اور یہودیوں کی طرف سے تورات میں کی جانے والی جانے والی تحریفات کا مزید ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

قصۂ قارون کا اُمتِ مسلمہ کی موجودہ حالتِ زار کے ساتھ انتہائی گہرا تعلق ہے اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعاتِ خسف کی حقیقت بھی قارون کے کردار اور فتنۂ قارونیت کو سمجھنے سے ہی معلوم ہوسکتی ہے۔

قرآن کریم میں قصۂ قارون سورۃ القصص کی درج ذیل آیات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ص/ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ق/ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ/ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ/ (٧٦) وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ/ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا/ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ/ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ط/ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ/ (٧٧)قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ ط/ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ/ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ط/ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ/ (٧٨) فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ ط/ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا/ يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ قَارُوْنُ لا/ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (٧٩) وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ/ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج/ وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ/ (٨٠) فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ قف/ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ق/ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ/ (٨١) وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ/ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ج/ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا/ لَخَسَفَ بِنَا ط وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ/ (٨٢) تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ط/ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ/ (٨٣)

اابے شک قارون موسیٰؑ کی قوم ہی میں سے تھا پس اس نے ان پر سرکشی کی۔ اور ہم نے اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیوں کو ایک طاقتور جماعت بھی بمشکل ہی اٹھا سکتی تھی۔ جب اس کی قوم نے اسے کہا کہ تم (اپنی دولت پر) شیخی مت مارو، یقیناً اللہ شیخی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے عطاء کیا ہے، اس میں آخرت کو تلاش کرو اور مت بھولو کہ تمہارا نصیب ہے اس دنیا میں اور بھلائی کرو جیسا کہ (اللہ تعالیٰ نے) تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اور زمین میں فساد کے درپے نہ ہو بلاشبہ اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (قارون نے جواباً) کہا! یہ (مال و دولت) تو مجھے میرے علم کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل اس سے کہیں طاقتور اور مال دار قوموں کو ہلاک کر دیا تھا؟ اور (بوقتِ ہلاکت) مجرموں سے ان کے گناہوں کے متعلق نہیں پوچھا جاتا۔ پس (ایک روز) وہ اپنی مکمل زیب وزینت کے ساتھ قوم کے سامنے نکلا۔ (اُس کی یہ شان وشوکت دیکھ کر) اُن لوگوں نے جو دنیاوی زندگی کی طلب رکھتے تھے، کہا! اے کاش ہمارے پاس بھی وہ سب کچھ ہوتا جو قارون کو عطا کیا گیا ہے بے شک وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ اور کہا اُن لوگوں نے جنہیں (اللہ نے) علمِ حقیقی عطا کر رکھا تھا کہ تمہاری بربادی ہو (بلکہ حقیقت میں وہ شخص خوش قسمت ہے) جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کئے، (اُس کے لئے) اللہ کا ثواب کہیں بہتر ہے۔ اور یہ (ثوابِ عظیم) نہیں پاتے مگر وہی لوگ جو (ایمان اور عملِ صالح پر) ثابت قدم رہتے ہیں۔ پس ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر اُس کے لئے کوئی جماعت مددگار ثابت نہ ہوئی جو اسے اللہ (کے عذاب) سے بچاتی اور وہ بے یارومددگار ہی رہ گیا۔ اور کل تک جو لوگ اُس جیسا مقام ومرتبہ حاصل کرنے کی تمنا

کررہے تھے، آج کہنے لگے ارے یہ تو ہے ہی خرابی، اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے اور جس کو چاہتا ہے ناپ تلا عطا کرتا ہے۔ اور اگر اللہ ہم پر احسان نہ فرماتا تو ہمیں بھی (زمین میں) دھنسا دیتا۔ ارے یہ تو ہے ہی خرابی، انکار کرنے والے ہرگز فلاح نہیں پاتے۔ یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے تیار کیا ہے جو زمین میں بڑائی حاصل کرنا نہیں چاہتے اور آخرت کا گھر تو پرہیزگاروں کے لئے ہی ہے۔ ۱۱

(القصص ۸۳۔۷۶)

آیات درج بالا کی روشنی میں قارون کے متعلق درج ذیل نمایاں باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) قارون کا تعلق تو بنی اسرائیل سے ہی تھا مگر اس نے اپنی ہی قوم کے خلاف سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔

(۲) وہ اس قدر مالدار تھا کہ اس کے خزانوں کی چابیاں بھی ایک طاقتور لوگوں کا گروہ ہی اٹھا سکتا تھا۔

(۳) وہ ایک نہایت متکبر شخص تھا اور اپنی دولت کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تمام اسرائیلیوں کو نہایت حقیر خیال کرتا تھا۔

(۴) جب اس کی قوم کی طرف سے اسے نصیحت کی جاتی کہ اپنی دولت پر بے جا گھمنڈ مت کرو، خلقِ خدا کو اس کا حق ادا کرو اور احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کے ذریعے زمین میں فساد کے مرتکب مت بنو تو اس کا جواب یہ ہوتا کہ میں نے یہ سب مال و دولت اپنے علم، ذہانت اور تجربے کے ذریعے حاصل کیا ہے اور میں اپنی مرضی سے اس میں تصرف کا حق رکھتا ہوں۔

(۵) قرآن حکیم میں قارون کے اس مجموعی طرزِ عمل کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے گویا فتنہ قارونیت دراصل فساد فی الارض ہی کا ایک مظہر ہے۔

(۶) قارون کی ظاہری شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ سے عام اسرائیلی بہت متاثر ہوتے تھے اور ہماری طرح اُن کے نزدیک بھی دنیاوی زندگی کی زیب و زینت اور مال و دولت کی فراوانی ہی خوش قسمتی کا معیار تھی۔ گویا معاشی آسودگی اور معاشی ترقی ہی ان کی نظروں میں اہمیت کی حامل تھی جبکہ دین و مذہب کی تعلیمات اُن کے لئے ثانوی یا پھر اس سے بھی کم تر درجے کی اہمیت رکھتی تھیں۔

قارون کے متعلق کچھ اختلافی روایات بھی موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا چچازاد بھائی تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ فرعون کا درباری ملازم تھا۔

جہاں تک قارون کے موسیٰؑ کے چچازاد ہونے کا سوال ہے تو اس رائے کے یکسر درست یا غلط ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اصل مسئلہ قارون کے درباری ملازم ہونے یا نہ ہونے کا ہے۔ جن لوگوں کے خیال میں قارون کا دربارِ مصر سے کوئی تعلق نہ تھا، ان کی رائے میرے خیال میں بالکل غلط ہے اور جن کے خیال میں وہ فرعونِ مصر کا ایک عام درباری ملازم تھا، انہوں نے قارون کے دنیاوی مقام و مرتبہ کو بہت کم خیال کیا ہے حالانکہ وہ اپنے دور کا ایک نہایت اہم شخص تھا اور ہامان کی طرح فرعونِ مصر کا ایک اہم ترین درباری سردار تھا۔ اس کی تصدیق سورۃ المومن کی ان آیات سے ہوتی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا/ وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۲۳) اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ/ فَقَالُوْٓا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۲۴) فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا/ قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ/ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ط/ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ/

(۲۵)

۱۱ اور ہم نے بلاشبہ موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں اور ظاہر و زبردست حجت دے کر فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تھا۔ پس انہوں نے کہا یہ تو ایک جادوگر اور بہت بڑا جھوٹا ہے۔ پھر جب وہ (موسیٰؑ) ہماری طرف سے حق لے کر ان کے پاس آئے تو وہ کہنے لگے! اُن لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دو جو ایمان قبول کر کے ان (موسیٰؑ و ہارونؑ) کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو مگر کافروں کی یہ چال بے کار ثابت ہوئی۔ ۱۱ (المومن ۲۵۔۲۳)

آیات درج بالا میں قارون کا ذکر نہ صرف فرعون اور اس کے اہم ترین درباری ہامان کے ساتھ کیا گیا ہے بلکہ ان تینوں کی باہمی مشاورت سے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والوں کے قتل کے حکم کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ہامان

کے متعلق دیگر آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک ماہر تعمیرات تھا یا پھر محکمہ تعمیرات کا وزیر۔ فراعنہء مصر کے دور میں جو بڑے بڑے اہرام تعمیر کئے گئے تھے وہ مصری قوم کی تعمیرات کے شعبہ میں مہارت کے شاہکار تھے جس پر وہ بے حد نازاں تھے۔

آلِ فرعون کو اپنی تہذیب و تمدن پر جو فخر و غرور تھا، اس ٹیکنالوجی میں مہارت کی وجہ سے بھی تھا۔ ہامان چونکہ اس شعبہ کا اہم ترین آدمی تھا لہٰذا ہم اُسے اس ٹیکنالوجی کی ایک اہم علامت (Symbol) قرار دے سکتے ہیں۔

جہاں ایک طرف ہامان فرعون کی ٹیکنالوجی کی قوت کا نشان تھا، وہاں دوسری طرف قارون فرعون کی معاشی قوت کی علامت (symbol of economic power) تھا۔

قارون اپنی بے اندازہ دولت کی حفاظت کے لئے فرعون کی حکومتی سرپرستی کا محتاج تھا تو فرعون بھی اپنا حکومتی نظم و نسق چلانے کے لئے قارون کی معاشی قوت سے فائدہ اٹھانا ضروری خیال کرتا تھا۔ گویا اس طرح دونوں کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی سی ہو چکی تھی۔

قارون کو ہم بلاشبہ معاشی قوت کا ایک نشان (symbol) قرار دے سکتے ہیں۔

فرعون

یہاں کچھ تاریخی حقائق پیشِ نظر رہیں کہ فرعون کا تعلق مصر کی قدیم قبطی النسل قوم سے تھا جس نے اُن عربی النسل عمالقہ سے بزورِ قوت اقتدار حاصل کیا تھا جو غالباً حضرت ابراہیمؑ کے دور سے بھی پہلے مصر پر حکومت کرتے رہے تھے۔ تاہم ارضِ فلسطین میں ان کی حکومت اب بھی قائم تھی۔ فلسطین میں قائم عمالقی حکومت فرعون کے لئے ایک بیرونی خطرہ تھی تو ارضِ مصر میں حضرت یوسفؑ کے دور سے آباد ہو جانے والے بنی اسرائیل اس کے لئے ایک بڑا اندرونی خطرہ تھے جن کی آبادی بھی تیز رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔

دوسری طرف بنی اسرائیل میں بھی حضرت یوسفؑ کے دور کی ایسی روایات موجود تھیں جن کے مطابق انہیں مستقبل میں ارضِ فلسطین کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ ان روایات کا صریح مطلب مستقبل میں بنی اسرائیل کا عروج تھا۔

اور ان سب باتوں پر مستزاد فرعون کا وہ خواب بھی تھا جس کی تعبیر شاہی نجومیوں نے فرعون کی حکومت بنی اسرائیل کے ایک فرد کے ہاتھوں چھن جانے کی صورت میں تھی۔

فرعون مصر کی دو اہم پالیسیاں

انہی خدشات کے پیشِ نظر اُس وقت کے فرعون نے ایک پیشگی احتیاطی تدبیر کے طور پر بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے ہر بچے کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت اسی دور میں ہوئی تھی اور معجزانہ طور پر ان کی پرورش بھی فرعون کے محل میں ہوئی تھی۔

بچوں کے اس بے دریغ قتل کے نتیجہ میں جب ملک میں افرادی قوت کی کمی واقع ہوگئی تھی تو فرعون نے اس حکم پر عمل درآمد معطل کر دیا تھا۔

فرعون کی دوسری تدبیر بنی اسرائیل کو تقسیم کرنے کی پالیسی تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ / وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا / يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ / يُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَ هُمْ ط /

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ / (٤) وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ / وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ / (٥)

'' واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں بڑائی اختیار کر رکھی تھی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا اور ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتا جبکہ ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ یقیناً وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہمارا ارادہ تھا کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں ذلیل بنا کر رکھے گئے تھے تاکہ ہم انہیں پیشوا اور (سلطنت کا) وارث بنائیں اور انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائیں اور (تاکہ) ہم فرعون اور ہامان اور اس کے لشکروں کو ان (بنی اسرائیل) کے ہاتھوں وہی کچھ دکھلائیں جس سے وہ ڈرتے تھے (یعنی حکومت چھن جانے کا خوف جس میں وہ مبتلا تھے)۔''
(القصص ۵۔۴)

فرعون نے صرف یہی پالیسی اختیار نہیں کی تھی کہ قبطیوں اور بنی اسرائیل میں اونچ نیچ پیدا کر دی بلکہ بنی اسرائیل کو بھی اس طرح سے تقسیم کر دیا کہ ان میں سے ایک گروہ کو اپنا ہمنوا و مقرب بنا لیا تاکہ ان کے ذریعے باقی اسرائیلیوں پر کنٹرول رکھ سکے۔ قارون اسی طبقے کا اہم ترین فرد تھا۔ غالب امکان یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے دور سے بنی اسرائیل کو دربارِ مصر میں جو تقرب و اختیار حاصل ہو گیا تھا، اس کا بعض لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا ہوگا۔ انہوں نے نہ صرف دولت کے انبار لگائے ہوں گے بلکہ سلطنت کے انتظامی معاملات میں اہم رسوخ بھی حاصل کر لیا ہوگا۔ قبطیوں نے عمالقہ سے اقتدار بھی غالباً ایسے ہی لوگوں کی مدد سے حاصل کیا ہوگا جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انگریزوں نے برصغیر وغیرہ مختلف ممالک پر قبضہ وہاں کے غداروں کے ذریعے کیا تھا اور وہاں حکومت بھی انہی کی مدد سے کی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو (Divide and Rule) کا اصول بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنی خود تاریخ۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کو نبوت و رسالت عطا کی تو جہاں انہوں نے ایک طرف فرعون سے مطالبہ کیا کہ وہ خدائے واحد کی بندگی قبول کر لے اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تو دوسری طرف بنی اسرائیل کو بھی اپنی پیروی اختیار کرنے اور فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں اپنے ساتھ شریک ہونے کا مطالبہ کیا۔

موسیٰؑ کا یہ مطالبہ فرعون اور اس کے سرداروں کے نزدیک نہایت مضحکہ خیز و تمسخرانہ تھا کیونکہ موسیٰؑ اور ان کی قوم ان کے نزدیک نہایت معمولی اور حقیر تھی جبکہ وہ خود کو ایک برتر قوم تصور کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی حیثیت ان کے نزدیک ایک غیر مہذب اور اجڈ قوم کی سی تھی جس کے کسی فرد کی اطاعت کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن جب موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ''عصا'' اور ''ید بیضا'' کی نشانیوں کا مظاہرہ کیا اور بعد ازاں فرعون کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ساحروں سے مقابلہ میں فتح حاصل کر کے ان ساحروں کو ہی ایمان لانے پر مجبور کر دیا تو

فرعون اور اس کے درباریوں نے ایک طرف تو یہ پراپیگنڈہ کیا کہ دراصل موسیٰؑ تو ایک بہت بڑے جادوگر ہیں بلکہ جھوٹ موٹ کی شکست کھانے والے ان تمام جادوگروں کے 'گرو' بھی وہی ہیں اور ان سب کا مقصد اپنے جادو کے زور پر اقتدارِ مصر پر قبضہ کرنا ہے۔

دوسری طرف انہوں نے اُن لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیئے جو حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی دعوت و تحریک کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ ظلم و ستم کے اس عمل میں قارون آلِ فرعون کا ہمنوا اور اتحادی تھا۔ چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کے اندر بزدلی و پست ہمتی پیدا کر دی تھی لہٰذا فرعون کے مظالم اور اپنے ہی ہم قوم اکابر و اشراف کی مزاحمت کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

ان تمام دردناک احوال کا نقشہ درج ذیل آیاتِ قرآنی میں اس طرح سے کھینچا گیا ہے:

'' پس موسیٰؑ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم کے چند نوجوان جو فرعون اور اپنی قوم کے سرداروں کے ڈر کے باوجود ایمان لے آئے اور جنہیں یہ خوف بھی لاحق تھا کہ فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔'' (سورہ یونس ۸۳)

'' اور کہا موسیٰؑ نے اے ہمارے پروردگار! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیاوی زندگی میں زیب و زینت اور مال و دولت سے نواز رکھا ہے۔ اے ہمارے رب! کیا (ان کے لئے یہ سب کچھ) اس لئے ہے کہ وہ تیرے راستے سے گمراہ کریں؟ اے ہمارے رب! ان کے اموال کو غارت فرما اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تا کہ وہ ایمان نہ لا سکیں جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔'' (یونس ۸۸)

درج بالا آیات قرآنی میں جن سرداروں کا ذکر ہے ان میں وہ سردار بھی شامل تھے جو اگرچہ تعلق تو بنی اسرائیل سے رکھتے تھے مگر فرعون کے وفاداروں میں شامل تھے اور قارون ان میں سے اہم ترین اور امیر ترین سردار تھا۔

اب صورت حال کچھ اس طرح سے بن گئی تھی کہ عام لوگ تو فرعون اور موسیٰؑ کے مابین جاری اس کشاکش کو اقتدار کی رسہ کشی ہی سمجھ رہے تھے جبکہ وہ لوگ جو فرعون کے مظالم کا نشانہ بن رہے تھے، اس کا ذمہ دار حضرت موسیٰؑ کو ٹھہرا رہے تھے۔ اس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا ہے:

'' اور کہا موسیٰؑ کی قوم نے اے موسیٰؑ! تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ہم ستائے جا رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا! قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔'' (سورۃ الاعراف ۱۲۹)

اگرچہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو فرعون کی ہلاکت اور ''خلافت فی الارض'' کی نوید دے رہے تھے مگر بنی اسرائیل فرعون کے خلاف خروج کے لئے اپنے اندر ہمت و حوصلہ نہیں پاتے تھے۔ موسیٰؑ کی کئی سالہ جدوجہد بھی انہیں اس کے لئے تیار نہ کر سکی۔

حضرت موسیٰؑ کو دی گئی نو نشانیوں میں سے دو یعنی ''عصا'' اور ''ید بیضا'' کو تو سحر قرار دے دیا گیا جبکہ باقی سات نشانیوں یعنی قحط، نقص ثمرات، طوفان، ٹڈی دل، قمل (جوں)، مینڈک، اور خون کو قدرتی آفات اور موسیٰؑ کی نحوست قرار دے کر ان کی تکذیب جاری رکھی گئی۔

یہ دراصل خسفِ قارون کا واقعہ ہی تھا جس نے بنی اسرائیل کو مصر سے خروج پر آمادہ و مستعد کیا تھا۔

درحقیقت حضرت موسیٰؑ کی مخالفت میں پیش پیش اُن کے ہم قوم قارون کے عبرت ناک انجام نے ہی فرعون کا خوف کسی حد تک بنی اسرائیل کے دلوں میں سے کم کیا تھا اور وہ موسیٰؑ کی ہدایت کے مطابق مصر سے خروج کے لئے تیار ہوئے تھے۔

تورات کے بیان کے مطابق خسفِ قارون کا واقعہ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے بعد پیش آیا حالانکہ شروع میں بیان کی گئی سورۃ القصص کی آیات میں قارون اور اس کے گھر (جو یقیناً ایک عالیشان محل ہی ہوگا) کو زمین میں دھنسا دینے کا ذکر ہے۔ اور اس حقیقت سے تو تقریباً سبھی واقف ہیں کہ بحرِ قلزم پار کرنے کے بعد بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک ''صحرائے سینا'' میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتے رہے تھے۔

درحقیقت یہود نے قارون کے عظیم کردار کو معمولی ظاہر کرنے کے لئے تورات میں تحریف کی ہے۔ بدنام ترین کرداروں کی پردہ پوشی یا ان کے جرائم کو کم ظاہر کرنا اور صالح ترین کرداروں کی کردار کشی اور انہیں ان کے مقام و مرتبہ سے کمتر ظاہر کرنا ہمیشہ سے یہود کا شیوہ و وطیرہ رہا ہے جس کی مثالیں حضرت طالوتؑ اور حضرت سلیمانؑ کی موجودہ تورات میں بیان کی گئی کمتر اہمیت اور ان سے منسوب بے سرو پا باتیں ہیں جن کا ان عظیم ہستیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ پس حقیقت یہی ہے کہ خسفِ قارون کا واقعہ ارضِ مصر پر ہی بنی اسرائیل کے خروج سے پہلے پیش آیا تھا۔

عین ممکن ہے کہ مصر میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کا پس پردہ مقصد خزانۂ قارون کی تلاش ہی ہو۔ آثارِ قدیمہ کی تلاش کا یہ سلسلہ مغربی ماہرین آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ابھی تک جاری ہے۔

مزید برآں قارون جیسے متکبر شخص سے جو فرعون کو اپنا پشت پناہ اور مددگار سمجھتا تھا، یہ بات بھی بعید تھی کہ وہ موسیٰؑ کے ہمراہ مصر سے خروج کرتا حالانکہ وہ موسیٰؑ اور اپنے دیگر ہم قوم افراد کو نہایت حقیر و ذلیل خیال کرتا تھا۔ یقیناً ایسا کر کے وہ اپنے فخر و غرور، شان و شوکت اور جھوٹی انا کو خاک میں نہیں ملا سکتا تھا۔ اگرچہ خروج کرنے والوں میں ''سامری'' جیسے منافق لوگ بھی شامل تھے مگر ان سب نے مصر سے خروج کے متعلق حضرت موسیٰؑ کے حکم کی پیروی تو بہرکیف کی تھی جبکہ قارون کا متکبرانہ انداز ثابت کرتا ہے کہ وہ کسی بھی درجے میں موسیٰؑ کی پیروی نہیں کر سکتا تھا۔

درحقیقت ہر قوم کے جباروں و سرداروں کا اپنے انبیاء و رسل کے ساتھ یہی رویہ و معاملہ رہا ہے۔ اگر ہم سیرت حضرت محمد ﷺ پر غور کریں تو بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے۔

ابوجہل، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، عتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید اور عتبہ بن ابی معیط، یہ سب لوگ مکہ کے جباروں، دولت مندوں اور سرداروں کی حیثیت رکھتے تھے مگر انہوں نے حضور اکرمؐ کی شدید ترین مخالفت کی تھی اور فروغِ اسلام کی جدوجہد کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن ان سب کو قدرتِ الٰہی ''بدر'' کے میدان میں لقمۂ اجل بننے کیلئے کھینچ لائی تھی اور اسی فتحِ بدر نے مسلمانوں کیلئے مستقبل کی فتوحات کا دروازہ کھولا تھا۔

حضورؐ کا ایک اور شدید ترین مخالف آپؐ کا چچا ابولہب تھا جس کا ذکر قرآن میں بھی کر کے اس کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ ابولہب بھی ایک امیر ترین شخص تھا مگر غزوہ بدر میں شریک نہ ہوا تھا بلکہ اپنی جگہ کرائے کا سپاہی بھجوا کر اس نے حضورؐ اور اسلام کے خلاف اپنی شدید دشمنی کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ وہ بھی طاعون کی طرح کے کسی مرض میں مبتلا ہو کر عذابِ الٰہی کا شکار اور نشانِ عبرت بنا تھا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ''رحمۃ للعالمین'' بنا کر بھیجا تھا لہٰذا آپؐ کے مخالفوں پر براہِ راست عذابِ الٰہی نازل نہ ہوا تھا مگر قربِ قیامت کے وقت پانچ مختلف قسم کے عذاب ہائے الٰہی کی خبر تو آنحضورؐ امت کو پہلے ہی دے چکے ہیں جو یقینی طور پر ظہورِ حضرت مہدی کے قریبی زمانہ میں نازل ہوں گے تا کہ مخالفینِ اسلام کی بیخ کنی کے علاوہ مجاہدینِ اسلام کی نصرت ہو سکے۔

پس سیرت نبی اکرمؐ کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اسلام کے کھلے دشمنوں کو ہلاک کیا جاتا ہے تا کہ دوسرے لوگ عبرت و نصیحت حاصل کر سکیں۔

یہاں یہ حقیقت خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ ابولہب اور ابوجہل وغیرہ سب مخالفینِ اسلام نہ صرف حضورؐ کے ہم قوم تھے بلکہ بعض تو انتہائی قریبی عزیز بھی تھے۔

یہی معاملہ قارون کے ساتھ ہوا تھا۔ موسیٰؑ و ہارونؑ کا ہم قوم اور قریبی عزیز ہونے کے ناطے اس پر اس بات کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ نہ صرف موسیٰؑ پر ایمان لاتا بلکہ فرعون کے خلاف جدوجہد میں ان کا دست و بازو بھی بنتا۔ اس کی بجائے اس نے اپنے مفادات کے تحفظ اور فرعون کے تقرب کی خاطر اپنی قوم پر ہونے والے مظالم کی پشت پناہی کی اور اپنی بے تحاشا دولت پر بے جا گھمنڈ کیا ۔اس کی دولت سے اس کے ہم قوم غرباء و مساکین تو کوئی خاص بہرہ مند نہ ہوئے البتہ فرعون نے اس کی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

مزید برآں قارون نے (از روئے بائبل) موسیٰؑ کو بدنام کرنے کے لئے ایک سازش کے تحت آپؑ پر ایک فاحشہ عورت کے ذریعے 'زنا' کا الزام عائد کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔

ان سب کارستانیوں اور موسیٰؑ کی بددعا (جس کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے)، کے نتیجے میں بالآخر اسے زمین میں دھنسا کر بنی اسرائیل کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔

خسفِ قارون کے نتیجے میں بنی اسرائیل تو مصر سے خروج کے لئے ذہناً تیار ہو گئے لیکن فرعون نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ قارون اگرچہ فرعون کا اتحادی تھا لیکن اس کی ہلاکت ایک دوسرے پہلو سے فرعون کے لئے باعثِ مسرت اور اطمینان بھی تھی کیونکہ وہ بھی کسی وقت فرعون کے اقتدار کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ اطمینان اور خوشی کی اسی کیفیت میں وہ ایک قومی تہوار منانے میں مگن تھا کہ بنی اسرائیل موقع پاتے ہوئے، موسیٰؑ کی ہدایت پر مصر سے خروج کے لئے نکل پڑے۔ جب فرعون کو بنی اسرائیل کے خروج کا علم ہوا تو وہ بھی اپنے لشکروں کے ساتھ بنی اسرائیل کے تعاقب میں نکل پڑا ۔وہ نہیں جانتا تھا کہ جس قوم کو وہ دوبارہ غلام بنانے کی غرض سے جا رہا ہے اسے تو نُصرتِ الٰہی سے آزادی مل کر ہی رہے گی مگر وہ خود اور اس کے لشکر بحرِ قلزم میں غرق ہو کر نشانِ عبرت بن جائیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ غرق فرعون کا واقعہ بنی اسرائیل کے خروج پر ان کے لئے بطور نصرت ظہور پزیر ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰؑ کے حکم کی تعمیل میں مصر سے خروج کرنا درحقیقت اُن کے اس عزم و ارادہ کا اظہار تھا کہ اب وہ اپنے معاشرہ میں (حضرت موسیٰؑ کی اطاعت کی صورت میں) دین اللہ کو قائم کریں گے۔ اُن کے اس عزم و ارادہ اور عملی اقدام (یعنی خروج کے عمل) نے ہی غرق فرعون کی صورت میں نصرت الٰہی کا دروازہ کھولا تھا۔

بنی اسرائیل کے خروج اور از روئے حدیث نبوی ﷺ ارض مشرق سے لوگوں کے خروج کے مابین بہت گہرا تعلق ہے جسکی تفصیل انشاء اللہ آگے آ رہی ہے۔

قصۂ قارون و فرعون کے تناظر میں اگر ہم موجودہ عالمی حالات کا جائزہ لیں تو عصرِ حاضر کے قارون و فرعون کے کرداروں کی پہچان چنداں مشکل دکھائی نہیں دیتی۔ امریکہ دورِ حاضر کا فرعون بن چکا ہے تو مسلم ممالک کے اکثر و بیشتر حکمران قارون بن کر اسے تقویت فراہم کر رہے ہیں۔

(باب سوم)

فتنۂ قارونیت اور خسف بجزیرۃ العرب

قارون کے کردار کے متعلق تفصیلی بحث سے قارئین یہ حقیقت بخوبی جان گئے ہوں گے کہ فتنۂ قارونیت دراصل ایک معاشی فتنہ ہے جو مال و دولت کی فراوانی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کے اندر تکبر، اسراف اور زر پرستی وغیرہ رذیل اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان اخلاق بد کی وجہ سے انسان کے اندر سے دینی حمیت وقومی غیرت بھی اُٹھ جاتی ہے جسکا نتیجہ دوسری اقوام کی سیاسی و ذہنی غلامی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اگر ہم ذرا سا بھی غور کریں تو قارونیت کے فتنہ کے تمام اوصاف اس وقت جزیرۃ العرب کی خلیجی ریاستوں میں روزِ روشن کی طرح نظر آجائیں گے۔

درحقیقت یہ وہی فتنہ ہے جسے احادیث نبویہ ﷺ میں 'فتنۃ السراء' (خوشحالی کے فتنہ) کا نام بھی دیا گیا ہے (عن عبداللہ بن عمرؓ رواہ ابوداؤد) اور جس میں اہل عرب کے بالخصوص مبتلا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔

ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح قدرتی وسائل کی فراوانی بالخصوص تیل کی دولت کے فتنے نے اہلِ عرب کے اندر زر پرستی، عیش کوشی، پست ہمتی اور بزدلی جیسی گھٹیا صفات پیدا کر دی ہیں۔ اسراف وتبذیر اور استکبار کی بیماریاں عرب معاشرے کو گھن کی طرح کھا چکی ہیں۔ کسی زمانہ میں مفلوک الحال رہنے والے رہنے عرب بدو عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ عرب ممالک میں یہودیوں کی طرح سود خوری کا رواج عام ہو چکا ہے۔ حرام وحلال کا امتیاز مٹ چکا ہے اور حرام اشیاء کو نام بدل کر حلال ٹھہرایا جا چکا ہے جبکہ بے حیائی، فحاشی، زنا کاری اور سٹے بازی کے اڈے قانونی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

عجمی مسلمانوں (غیر عرب) کے ساتھ اہل عرب کا رویہ بھی قارون کی طرح نہایت متکبرانہ ہوتا ہے۔ اس کا احساس یقیناً ہر اُس شخص کو ہو چکا ہوگا جو کچھ عرصہ ان ممالک میں گزار چکا ہے۔ مغرب کے سفید فام لوگوں کو ''خواجہ'' کا نام دے کر انہیں آقا کی حیثیت دی جاتی ہے تو تیسری دنیا کے شہریوں کو ''رفیق'' اور ''مسکین'' وغیرہ کے القاب دے کر ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔

عرب حکمران قارون کی طرح اہل مغرب بالخصوص امریکہ کے اتحادی بن چکے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر لوگوں کو بادشاہتیں اور حکومتیں سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ وفاداری اور سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ غداری کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوئی تھیں۔ اپنی ان آمرانہ حکومتوں کو طول دینے کے لئے انہوں نے اہلِ مغرب کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔

عراق کے کویت پر قبضہ کے بہانہ کی آڑ میں انہوں نے غیر مسلم افواج کو جزیرۃ العرب میں طلب کر کے نہ صرف کھلم کھلا قرآن وحدیث کے احکامات کی خلاف ورزی کی بلکہ اس کے خلاف اٹھنے والی ہر صدائے حق کو بھی دبا دیا۔ اُسامہ بن لادن کا قصور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا کہ انہوں نے کویت کی آزادی کے بہانے امریکی و یورپی افواج کے جزیرۃ العرب میں داخلے کی پرزور مخالفت کی تھی جس کے نتیجہ میں انہیں پہلے سوڈان اور پھر افغانستان کو ہجرت کرنا پڑی تھی۔

مستقبل میں غلبۂ اسلام اور ظہورِ حضرت مہدی کی واضح پیشگوئیوں کے باوجود اہلِ عرب کے اندر امریکہ ویورپ کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ ناپید ہو چکا ہے۔

بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود عرب دنیا ایک چھوٹے سے ملک ''اسرائیل'' کے سامنے بے بسی کی تصویر بنی نظر آتی ہے۔ قبلۂ اول ''بیت المقدس'' کو یہود کے پنجہ سے آزاد کروانے کی کوئی سنجیدہ کوشش ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ کی دعوتِ اسلام کے اولین مخاطب، آپؐ کے ہم قوم اور ہم زبان ہونے کے ناطے اہلِ عرب پر جو اضافی دینی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھی، ان سے صریحاً انحراف کیا گیا ہے۔

اس کے برعکس عرب حکمران ''نام نہاد دہشت گردی کے خلاف مہم'' میں امریکہ ویورپ کا ساتھ دے کر راسخ العقیدہ مسلمانوں اور اپنے سیاسی مخالفین کا قلع قمع کرنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اس دنیا کو ہی اپنا مطلوب ومقصود بنا لینے والی اور قارونیت کے معاشی فتنہ میں مبتلا عرب دنیا کے لئے سورۃ القصص کی درج ذیل آیات بہت سبق آموز ہیں اور یقیناً اہلِ عرب ہی ان آیات کے اولین مخاطب ہیں:

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ/ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ/ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا/ يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ

رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا/ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ/ (۵۷) وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ/ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ/ لَمْ تُسْكَنْ

مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ/ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۵۸) وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى/ حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا/ يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اٰیٰتِنَا ۚ/ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى/ اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (٥٩) وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ/وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ط/ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (٦٠)

'' اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے اس (ہدایت) کی پیروی کر لی جو آپؐ لے کر آئے ہیں تو ہم اپنی سرزمین سے اچک لئے جائیں گے۔ کیا ہم نے انہیں امن والے حرم میں تمکن عطا نہیں کیا کہ جس کی طرف تمام اشیاء کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں؟ یہ رزق ہے ہماری طرف سے لیکن ان میں سے بہت سے لوگ (اس حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔ اور کتنی ہی وہ بستیاں ہم ہلاک کر چکے ہیں جو اپنی معیشت پر اِترا گئی تھیں۔ پس یہ رہے ان کے مسکن جو آباد نہ ہوئے ان کے بعد مگر بہت کم اور ہم ہی ان کے وارث تھے۔ اور آپ کا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں جب تک ان کے مرکز (اُمّ القریٰ) میں کوئی رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں لیکن اس صورت میں کہ ان کے رہنے والے ظالم ہوں۔ اور جو کچھ (رزق) تمہیں دیا گیا ہے تو وہ (صرف) دنیا کا ساز و سامان اور اس کی زینت ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے، وہ کہیں بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

(القصص ٦٠۔٥٧)

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہ آیات قصۂ قارون سے قبل صرف پندرہ آیات کے فاصلے پر ایک ہی سورۃ مبارکہ میں بیان ہوئی ہیں اور اہلِ عرب کے فتنۂ قارونیت میں مبتلا ہونے کی تصدیق کرتی ہیں۔

مزید برآں سورۃ الزخرف کی درج ذیل آیات تو گویا صرف اہلِ عرب کے لئے ہی نازل ہوئی ہیں:

'' تو اب ہم آپؐ کو خواہ (اس دنیا سے) لے جائیں بہرحال ہم ان کو سزا دے کر رہیں گے۔ یا (یہ بھی ہو سکتا ہے) کہ ہم آپ ﷺ کو دکھائیں وہ (عذاب) جس کا ہم نے ان سے وعدہ کر لیا ہے۔ پس بلاشبہ ہم ان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ تو آپؐ اس (کتاب) کو مضبوطی سے تھامے رکھئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ یقیناً آپؐ سیدھے راستے پر ہیں۔ اور درحقیقت یہ کتاب آپؐ کے لئے اور آپؐ کی قوم کے لئے ایک یاددہانی و مقامِ شرف ہے اور عنقریب (اس کے متعلق) تم سے (اے اہلِ عرب) پوچھ گچھ ہوگی۔''

دینِ امین اور قرآنِ عظیم کے حامل ہونے کے ناطے اہلِ عرب کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ قرآنِ عالیشان جیسی نعمت کے براہِ راست حامل ہونے کے ناطے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں عجمی مسلمانوں سے زیادہ سزا بھگتنا پڑے گی اگر وہ قرآنِ کریم کی تعلیمات سے روگردانی کا اپنا موجودہ رویہ اسی طرح برقرار رکھیں گے۔

دنیا میں ان کے لئے سزا کی پیش گوئی خود حضور اکرمؐ ''خسف بجزیرۃ العرب'' کی صورت میں آج سے چودہ سو سال پہلے فرما چکے ہیں۔ مگر افسوس درافسوس عرب دنیا خوابِ غفلت اور اپنی عیش و عشرت کی زندگی میں اس طرح سے مگن ہے کہ اس ''خسف بجزیرۃ العرب'' کی وجوہات کو نہ سمجھنے اور یا پھر ان سے آنکھیں چرانے میں ہی اپنی بہتری خیال کر رہی ہے۔ تعجب ہے کہ خلیج فارس کے کنارے واقع لہو و لعب اور عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی بستیاں درج ذیل آیاتِ قرآنی سے کیونکر غافل ہو چکی ہیں جبکہ ان کی آنکھوں کے سامنے آنے والے بحرِ ہند کے سونامی اور پاکستان کے زلزلہ نے کتنی ہی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے؟

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ/ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ/ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (٤٥) اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ/ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (٤٦) اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ط/ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (٤٧)

'' تو کیا وہ لوگ جو برائی کی چالیں چل رہے ہیں (یعنی مختلف حیلوں بہانوں سے حرام کو حلال ٹھہرا رہے ہیں) اس سے بے خوف ہیں کہ انہیں اللہ زمین میں دھنسا دے۔ یا ان پر ایسے رخ سے عذاب آن پڑے کہ (جس کے بارے میں) انہیں گمان بھی نہ ہو۔ یا پھر ان کو پکڑ لے (اس حالت میں) کہ وہ اپنی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ (زمین میں) چل پھر رہے ہوں۔ اور یا پھر پکڑ لے ان کو (اس حالت میں) کہ انہیں (عذاب الٰہی کا) کھٹکا لگا ہوا ہو۔ پس (اگر تم اپنی روش سے باز آ جاؤ تو) تمہارا رب بہت شفیق اور مہربان ہے۔'' (النحل ٤٧۔٤٥)

آیات درج بالا درحقیقت خسف بجزیرۃ العرب کی وعید ہیں اور راقم کے خیال میں اس خسف کے امکانات خلیج فارس کے کنارے واقع سلطنتِ اومان سے لے کر کویت تک کے علاقے میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور اس عذاب الٰہی کا مرکز متحدہ عرب امارات کا علاقہ ہو سکتا ہے۔

واللّٰہ اَعْلَمُ بِالصَّوابُ

خسف بجزیرۃ العرب کے متعلق بعض لوگ اس مغالطہ میں مبتلا ہو سکتے ہیں (راقم خود بھی شروع میں اس مغالطہ کا شکار رہا تھا) کہ اس سے مراد وہ عذابِ خسف ہے جس کا شکار وہ لشکر ہوگا جو حاکمِ عراق و شام 'سفیانی' کی طرف سے بھیجا جائے گا اور جس کا مقصد حضرت مہدیؑ اور ان کے اصحاب کی سرکوبی کرنا ہوگا جو اُس وقت ظہور فرما چکے ہوں گے اور حرمِ کعبہ میں پناہ گزین ہوں گے۔ لیکن ایسا خیال کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ قصۂ قارون کے تناظر میں اس کی حقیقت راقم تفصیلاً بیان کر چکا ہے۔ اگر جزیرۃ العرب کے واقعۂ خسف سے مراد ''خسفِ بیداء'' ہی ہوتا تو آنحضورؐ اس کے لئے خسف بجزیرۃ العرب کے الفاظ ہرگز استعمال نہ فرماتے۔

درحقیقت مکۃ المکرّمۃ اور مدینۃ المنورۃ کے درمیان واقع ''وادیٔ بیدا'' کا خسف زمین کے تین خسوف کے علاوہ ہوگا اور جس کا ذکر قرآن کریم میں غالباً اس طرح سے کیا گیا ہے:

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا/ (٦٨)

''کیاتم بےخوف ہواس بات سے کہ وہ (تمہارارب) تمہیں خشکی پر ہی (زمین میں) دھنسادے؟ یا (پھر) تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے، پھر نہ پاؤ تم اپنے لئے کوئی کارساز۔''

(سورہ بنی اسرائیل ٦٨)

خسف بالمشرق، خسف بالمغرب اور خسف بجزیرۃ العرب کے متعلق ہونے والی بحث اور کتاب ہذا کے سرورق پر دیئے گئے نقشوں کی مدد سے قارئین یہ حقیقت جان چکے ہوں گے کہ ان تینوں کے ممکنہ نشانے سواحلِ سمندر کے علاقے ہیں۔ جبکہ ''وادیٔ بیداء'' کا واقعۂ خسف مکمل طور پر 'خشکی' پر رونما ہوگا اور یہ غالباً اس لئے ہوگا کہ قبل ازیں ظہور پذیر ہونے والے تینوں واقعاتِ خسف ماہرین ارضیات وغیرہ کی موشگافیوں اور تاویلوں کا شکار ہو جائیں گے یا کر دیئے جائیں گے۔ اہل ایمان تو ان واقعات کی حقیقت یقیناً جان چکے ہوں گے لیکن مادہ پرست اور دین و مذہب سے بیزار نام نہاد روشن خیال لوگ (مثلاً سفیانی اور اس کے ساتھی) انہیں عذابِ ہائے الٰہی سمجھنے سے انکار کر دیں گے لہٰذا ساحلِ سمندر سے دُور ''وادیٔ بیداء'' کا خسف ایسے لوگوں پر بھی اتمامِ حجت ہوگا اور جو لوگ سفیانی کے لشکر میں شامل ہوں گے، اُن کے لئے عذاب۔

(باب چہارم)

فتنۂ فرعونیت اور خسف بالمغرب

فرعون کے کردار کے متعلق تفصیلی بحث سے قارئین یہ حقیقت جان ہی چکے ہوں گے کہ فتنۂ فرعونیت دراصل فتنۂ اقتدار ہے جو اختیارات کے ارتکاز، مطلق العنانیت اور غیر معمولی طاقت وقوت کے حاصل ہوجانے پر پیدا ہوتا ہے۔ اس فتنہ میں مبتلا شخص خود کو 'مالک الملک'' سمجھنے لگتا ہے یا پھر ''اَنَا رَبُّکُمُ الاَعْلٰی'' کا نعرہ لگا کر خدائی کا دعویدار بن جاتا ہے۔ حضرت ابرہیمؑ کے زمانے میں نمرود اور حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون غیر معمولی طاقت واختیارات کے حاصل ہوجانے پر انہی باتوں کے دعویدار تھے حالانکہ یہ زمین اس کے خالق کی ملکیت ہے اور انسان کو محض بطورِ امانت اس میں اختیارات تفویض کئے گئے ہیں تاکہ وہ اس کے خالق اور مالکِ حقیقی کی مرضی ومنشاء کے مطابق ان اختیارات کو استعمال کرے۔

(امریکا) دورِ حاضر کا سب سے بڑا فرعون

جب اس زمین میں، اس کے مالکِ حقیقی کے دین یعنی دین اللہ کے مطابق نظامِ زندگی کو قائم نہیں کیا جاتا تو ''فساد فی الارض'' رونما ہوجاتا ہے۔

فساد کا لفظ 'اصلاح' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اصلاح فی الارض اس کائنات اور ہماری اس زمین کے خالق ومالکِ حقیقی کے دین یعنی دین اللہ کے نفاذ سے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ دین اللہ سے انحراف وبغاوت کے نتیجہ میں قائم ہونے والا ہر نظام فرعونی ونمرودی نظام ہے جسے قرآن کریم میں ''طاغوت'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔

طاغوت سے مراد ہر وہ ہستی یا نظامِ حیات ہے جو دین اللہ سے بغاوت، انحراف یا تجاوز کرے۔

دورِ حاضر کا موجودہ عالمی نظام درحقیقت طاغوتی نظام ہے اور اس طاغوتی نظام کی اعلیٰ ترین مثال ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا نظام مملکت قرار دیا جاسکتا ہے۔

اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کے دور کے فرعون کے فرعونی نظام مملکت اور طرزِ فکر اور موجودہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حکمرانوں کے نظامِ مملکت اور طرزِ فکر میں حددرجہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ آلِ فرعون کی طرح امریکی بھی خود کو ایک برتر قوم سمجھتے ہیں اور اپنی مادر پدر آزادی، جمہوریت، نام نہاد مساوات، اپنے طاغوتی نظام مملکت، اپنی برتر تہذیب وتمدن (جو فتنہ دجال کی پیش خیمہ بننے والی تہذیب ہے)، اپنی بے اندازہ سائنسی ترقی اور اپنی ناقابلِ شکست سمجھی جانے والی فوجی قوت پر غیر معمولی فخر وتکبر کا اظہار کرتے ہیں۔

جس طرح فرعون نے بنی اسرائیل کو ''مستقبل کا خطرہ'' خیال کرتے ہوئے ان کے بچوں اور نوجوانوں کا قتل عام کیا تھا، اُسی طرح امریکہ ''نام نہاد دہشت گردی کے خلاف مہم'' کے نام پر مستقبل کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اُمتِ مسلمہ کے مجاہدین پر دہشت گردی، انتہاپسندی، تشدد پسندی اور بنیاد پرستی وغیرہ کے الزامات لگا کر ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ اپنے سیاسی ومعاشی مفادات کی حفاظت کے نام پر دنیا کے ہر ملک میں مداخلت کرنا اس کی پالیسیوں کا اگرچہ ماضی میں بھی ایک خاص طرۂ امتیاز رہا ہے تاہم 11 ستمبر 2001ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور اس کے فوجی ہیڈکوارٹرز (پینٹاگون) پر حملوں کے بعد اس کی جارحانہ خارجہ پالیسیوں میں حد سے زیادہ شدت آچکی ہے۔ افغانستان اور عراق پر قبضہ کرنے کے بعد ایران، شام، سعودی عرب، پاکستان اور شمالی کوریا بالخصوص اس کی نظروں میں ہیں اور ان ممالک پر مختلف حربے استعمال کرکے انہیں اپنا زیرِ نگیں کرنے یا رکھنے کی کوششیں مسلسل جاری ہیں۔

حال کی طرح امریکہ کا ماضی بھی سفاکیت، بربریت اور چنگیزیت کا حامل ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کے شہروں ''ہیروشیما'' اور ''ناگاساگی'' پر ایٹمی حملوں سے لے کر اب تک کتنے ہی ممالک میں وہ اپنی جارحانہ کاروائیوں کے ذریعے لاکھوں انسانوں کا خون بہاچکا ہے۔

یقیناً اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکہ دورِ حاضر کا سب سے بڑا ''فرعون'' ہے۔ اور ہر فرعون راموسیٰ کے محاورے کے مطابق اس فرعون کو چیلنج کرنے والی شخصیت یعنی مجاہدِ اسلام اُسامہ بن لادن بھی بارہا امریکہ کو ''عصرِ حاضر کا فرعون'' قرار دے چکے ہیں۔

''فرعون مصر'' کی طرح ''فرعونِ عصر'' (امریکہ) بھی اُسی طرح اُمتِ مسلمہ کے حکمرانوں کو اپنا ہمنوا واتحادی بناچکا ہے جس طرح بنی اسرائیل کے سرداروں بشمول قارون کو فرعون نے اپنا ہمنوا ومقرب بنالیا تھا۔ اسی طرح وہ قارونیت کے فتنہ میں مبتلا اُمتِ مسلمہ کے کٹھ پتلی حکمرانوں کو ان کے اپنے ہی ہم قوم راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خلاف کاروائیوں کے لئے استعمال کررہا ہے۔

قارون کی طرح نام نہاد مسلمان حکمران بھی اپنے ہی ہم قوم افراد کے خلاف سرکشی کے مرتکب ہورہے ہیں۔ اور جو لوگ امریکی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کررہے ہیں، انہیں یہ نام نہاد حکمران اپنے غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی اور کاسہ لیسی کی خاطر ان کے حوالے کررہے ہیں یا قید وبند کی صعوبتوں سے گزار رہے ہیں اور یا پھر ان کو دہشت گرد قرار دے کر جعلی فوجی وپولیس مقابلوں میں ہلاک کروارہے ہیں۔

دورِ حاضر کا حیرت انگیز معجزہ یہ ہے کہ جس طرح موسیٰؑ معجزانہ طور پر فرعونِ مصر کے محل میں پلے بڑھے تھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دورِ حاضر کے مجاہدین اسلام کو بھی امریکی گود میں پروان چڑھایا ہے۔ موجودہ دور کے اکثر مجاہدینِ اسلام جہادِ افغانستان کی پیداوار ہیں اور یا پھر اس جہاد نے ہی انہیں متاثر کیا ہے اور اس جہادِ افغانستان میں امریکہ کا جو کردار رہا ہے، سبھی کے سامنے ہے۔ امریکیوں کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ اس جہادِ افغانستان میں شریک لوگوں نے اپنا اپنا حصہ وصول کیا ہے۔ امریکہ نے اپنے سیاسی مفادات حاصل کرلئے تو ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار میں مبتلا نام نہاد جہادی کمانڈروں نے بھی اپنا حصہ وصول کرلیا۔ لیکن کیا خالص دینی جذبے کے تحت جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہونے والوں کی قربانیاں رائیگاں چلی جاتیں؟

یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس جہاد کی برکات سے بالآخر ایک اسلامی ریاست ''طالبان حکومت'' کی شکل میں قائم ہوئی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہادافغانستان کے دوران امریکی اثر ورسوخ کے تحت رہنے کے باوجود حقیقی مجاہدین اسلام اپنی دینی وملی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئے تھے۔اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جونہی روس نے افغانستان کو خیر باد کہا اور امریکہ نے وہاں اپنی من پسند حکومت قائم کروانے کے لئے مسلح افغان گروپوں کے مابین خانہ جنگی کو ہوا دی تو مخلص مجاہدین اسلام نے امریکی چالوں کو بھانپ لیا اور فضاء اب امریکہ کے خلاف ہموار ہونا شروع ہوگئی۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک سازش کے تحت عراق کا کویت پر 1990ء میں قبضہ کروایا گیا اور اس کے فوراً بعد امریکی ویورپی افواج کویت کی آزادی کے بہانے جزیرۃ العرب میں داخل ہوئیں تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے اُسامہ بن لادن نے کی جو جہادِ افغانستان میں ایک اہم کردار ادا کر چکے تھے۔

مجاہدین اسلام کی دلی تمناؤں وجدوجہد کے نتیجہ میں کئی سال کی خانہ جنگی کے بعد جب افغانستان میں طالبان تحریک کے روحِ رواں 'ملا عمر مجاہد' کی قیادت میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آگئی تو یہ دنیا بھر کے مجاہدین فی سبیل اللہ کا مرکز وپناہ گاہ بن گئی۔

اگرچہ ابتدائی دور میں پاکستانی اور امریکی ایجنسیوں نے طالبان تحریک کی سرپرستی کی تھی تاکہ اپنے مفادات کے حصول کے لئے انہیں استعمال کیا جاسکے۔تاہم جب طالبان رہنماؤں نے ملک میں شریعتِ اسلامی نافذ کی اور بعدازاں امریکی اثر ورسوخ کو قبول نہ کرتے ہوئے اپنے ملک میں تیل وگیس کی تلاش کے لئے ایک امریکی کی بجائے برازیلی کمپنی کو ترجیح دی تو پوری دنیا کو اپنا محکوم اور تابع فرمان سمجھنے والا امریکہ اس جرأت کو کیسے گوارا کرسکتا تھا؟ باقی رہی سہی کسر طالبان نے اسامہ بن لادن کو پناہ دے کر اور اسے امریکہ کے حوالے نہ کرنے کی وجہ سے پوری کردی تھی۔

لہٰذا اب امریکہ نے طالبان حکومت کے زیر اثر بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے فروغ کا بہانہ گھڑا اور دہشت گردی کی آڑ میں افغانستان پر ناروا پابندیاں عائد کردیں جو پہلے ہی ایک طویل جنگ کے نتیجہ میں تباہ حال ہو چکا تھا۔افغانستان کے خلاف کاروائی کے لئے مختلف حیلے بہانے تراشے جاتے رہے اور بالآخر 11 ستمبر 2001 کے واقعہ نے جلتی پر تیل کی بجائے پٹرول کا کام دیا اور افغانستان پر حملہ آور ہونے کے لئے کوئی عذر مانع نہ رہا بلکہ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے افغانستان پر حملہ آور ہونے کے لئے نام نہاد اقوام متحدہ نے امریکہ کو کھلی چھٹی دے دی کہ اس غریب ملک کو آتش وآہن کی بارش سے نہلا دے۔

نہتے طالبان اور القاعدہ مجاہدین دنیا کی سب سے بڑی اور جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس قوت کا کب تک براہ راست مقابلہ کرتے؟ لہٰذا انہوں نے اپنی حکومت کی قربانی دے کر گوریلا جنگ کا فیصلہ کیا لیکن فرعونِ وقت کی غلامی قبول کرنے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی غیر منصفانہ مصالحت سے انکار کردیا۔اُس دن سے لے کر اب تک مجاہدین اسلام جہاد فی سبیل اللہ کا علم بلند کئے ہوئے ہیں۔مجاہدین اگرچہ گوریلا جنگ کررہے ہیں تاہم اس جنگ کے نتائج ویت نام اور روسی قبضہ کے دوران افغانستان کی گوریلا جنگوں کی طرح زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ گوریلا جنگیں ایک مضبوط سپلائی لائن کے بغیر جیتنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ویت نام کی جنگ میں روس اور چین امریکہ کے خلاف ویت نامیوں کی مدد کررہے تھے جبکہ روسی قبضہ کے دوران افغانستان کی گوریلا جنگ کی پُشت پناہی امریکہ اور اُس کے اتحادی کررہے تھے جن میں پاکستان بھی شامل تھا۔لیکن طالبان کی امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ کے فوری طور پر نتیجہ خیز ہونے کے امکانات بہت کم ہیں کیونکہ اس وقت کوئی بڑی طاقت تو کجا کوئی ایک چھوٹا ملک بھی اُن کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

بلاشبہ طالبان مجاہدین اللہ کی نُصرت کے محتاج بھی ہیں اور اس کے حق دار بھی۔

راقم کے خیال میں یہ نُصرت زمین کے تین خسوف کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

میرے اس خیال کی تائید مسند امام احمد کی اُس مشہور روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت نعمان بن بشیرؓ ہیں اور جس کا تذکرہ بانی تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد اکثر وبیشتر کرتے رہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا!

''تمہارے مابین نبوت موجود رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا۔اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت قائم ہوگی اور یہ بھی اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ قائم رہے، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔پھر کاٹ کھانے والی (یعنی ظالم) بادشاہت آئے گی اور وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔پھر مجبوری (یعنی غلامی) کی بادشاہت کا دور آئے گا اور وہ رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا، اور پھر دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہوگی۔''

اس روایت کی روشنی میں بقول ڈاکٹر اسرار احمد اُمت مسلمہ اس وقت چوتھے دور سے گزر رہی ہے۔اس دور کا پہلا مرحلہ طاغوتی نظام کے علمبردار مغربی سامراج کی براہ راست یا بلاواسطہ غلامی کی شکل میں تھا اور دوسرا مرحلہ اس وقت بلواسطہ (Indirect) غلامی کی شکل میں جاری ہے۔کیونکہ اُمتِ مسلمہ کے تقریباً سبھی حکمران بظاہر آزاد ہونے کے باوجود مغربی سامراج کی ذہنی غلامی کو قبول کئے ہوئے ہیں اور ان میں سے کوئی ایسا حکمران نہیں جو اپنی آزاد مرضی سے اپنی آزاد پالیسیاں بالخصوص خارجہ پالیسی مرتب کرسکے۔اگر کچھ حکمرانوں نے ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا تو انہیں منظر عام سے ہٹا دیا گیا۔

افغانستان میں قائم ہونے والی طالبان حکومت دورِ حاضر کی واحد مثال ہے جو اس موجودہ صورت حال سے مستثنیٰ ہے۔طالبان حکومت ایک مکمل آزاد حکومت بھی تھی اور نبوت کے طریق پر قائم ہونے والی خلافتِ راشدہ کی جھلک بھی اس میں نظر آتی تھی جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارا دورِ غلامی اب ختم ہونے کو ہے اور اُمت عنقریب ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' کے دور میں داخل ہوا چاہتی ہے۔

افغانستان میں امیر المومنین ملا عمر مجاہد کی زیر قیادت ایک اسلامی حکومت کا قائم ہونا مستقبل کے اسی دورِ مبارک وباسعادت کی تمہید قرار دیا جاسکتا ہے اور زمین کے تین خسوف اسی سلامی مملکت کی نُصرت کے لئے ظہور پذیر ہوں گے۔

۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ میں کامیابی کے بعد جب امریکہ نے یک قطبی دنیا اور ورنیو ورلڈ آرڈر کے نعرے بلند کئے تھے تو یہ درحقیقت فساد فی الارض کا نقطۂ آغاز تھا کیونکہ زمینی حقائق کے مطابق اُس وقت وہ سُنۃ اللہ اٹھ گئی تھی جس کا ذکر درج ذیل آیت میں کیا گیا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ /بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ /لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ /وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲۵۱)

۱۱ اوراگراللہ (لوگوں کے) ایک گروہ کودوسرے (گروہ) کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو روئے زمین پرضرورفساد برپا ہوجاتا لیکن اللہ تعالیٰ اہل عالم پر بڑامہربان ہے۔۱۱ (البقرہ ۲۵۱)

اگر چہ کُرہ ارض پر دین اللہ کا نافذ نہ ہونا بھی فساد فی الارض ہی ہے تاہم جب ایک بڑی طاغوتی قوت کوچیلنج کرنے کے لئے کوئی دوسری موثر قوت (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کام نہ کررہی ہوتو فسا دفی الارض کی انتہا ہونے لگتی ہے اور یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس وقت متحدہ یورپ، روس اور چین جیسی بڑی طاقتیں بھی امریکہ کا مدمقابل بننے سے حتی الامکان گریز کررہی ہیں۔لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ میں تمام چھوٹی بڑی طاقتیں امریکی عزائم کی تکمیل میں اُس کی مددگار وآلہء کار بن گئی تھیں۔امریکہ نے لبنان، لیبیا، بلقان، صومالیہ اور سوڈان وغیرہ متعدد ممالک میں مداخلت کی لیکن کوئی اُس کی مخالفت نہ کرسکا۔۲۰۰۱ء میں امریکہ نامعلوم دہشت گردوں کے نشانوں کی زد میں آیا تو ساری دنیا نے 'دہشت گردی کے خلاف مہم' کے نام پر قانونی تقاضے پورے کیے بغیر افغانستان جیسے غریب اور تباہ حا ل ملک کومزید تباہ وبرباد کرنے کیلئے نام نہاد سلامتی کونسل کے ذریعے اُسے ریاستی دہشت گردی کا لائسنس عطا کردیا۔۲۰۰۳ء میں اُس نے اقوامِ متحدہ اور اُس کی سلامتی کونسل کو بھی جوتے کی نوک پر لکھتے ہوئے کُرہ ارض کی سلامتی کے لئے قائم کیے جانے والے اس پُرفریب ادارہ کا آخری بھرم بھی پاش پاش کردیا۔وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تلاش کے نام پر پہلے سے تباہ حال ملک عراق کی ایک با رپھر اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

جب انسانی عقل سے تراشیدہ اصولوں وقوانین کے تحت چلنے والے اور دین اللہ سے سرکشی اختیار کیے ہوئے اس ادارہ (اقوامِ متحدہ) کا آخری بھرم بھی ٹوٹ گیا تو راقم کے نزدیک یہ فساد فی الا رض کی آخری انتہا تھی۔اس کے بعد قدرتِ الٰہی حرکت میں آجاتی ہے اور عذاب ہائے الٰہی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہاتھوں تاخت وتاراج ہونے والے دو مسلم ملکوں (افغانستان وعراق) کے بیچ واقع ایران ۲۶ دسمبر ۲۰۰۳ء کو ہولناک زلزلہ کا شکار ہوا اور اُس کا شہر 'با م' صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

۲۰۰۴ء میں مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک 'انڈونیشیا' بحرِ ہند میں آنے والے تباہ کن سونامی کا سب سے بڑا شکار بنا۔

۲۰۰۵ء کے اگست، ستمبر میں امریکہ قطرینہ، ولما اور ریٹا نامی طوفانوں کی صورت میں عذاب الٰہی کا شکار ہوا۔

اور ۸، اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ماہِ مقدس کے عشرہ رحمت میں پاکستان ہولناک زلزلہ کی صورت میں غضبِ الٰہی کا شکار ہوا۔

اُمت مسلمہ طاغوت کی غلامی میں

قابل غور بات یہ ہے کہ آخر مسلمان ہی کیوں غضب الٰہی کا زیادہ تر نشانہ بن رہے ہیں؟ اور یہ کہ دنیا بھر میں ظلم وستم کا نشانہ بھی صرف اُنہیں کو بنایا جارہا ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں درج ذیل آیت قرآنی سے مل سکتا ہے:

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ/ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ط/ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ/ وَغَضِبَ عَلَيْهِ/ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ/ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ط/ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا/ وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ/ (۶۰)

۱۱ آپ ﷺ فرمایئے! کیا میں تمہیں بتاؤں کہ ان (اہل کتاب) میں سے انجام کے لحاظ سے زیادہ بُرے کون ہیں؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور اُن پر اُس کا غضب ٹوٹا اور اُس نے بنادیا اُن میں سے بعض کو بندر اور خنزیر اور (وہ لوگ بھی) جنہوں نے طاغوت کی غلامی اختیار کی، یہی لوگ زیادہ بدتر ہیں درجہ میں اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں سیدھے راستے سے۔۱۱ (المائدہ ۶۰)

یہ آیت یہود کے دو طبقات کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ان میں سے ایک طبقہ وہ تھا جس نے احکام شریعت کو مسخ کیا تھا لہذا انہیں سزا بھی ان کی شکلیں مسخ کرکے یعنی بندر اور سؤر کی صورت میں تبدیل کرکے دی گئی تھی۔

جبکہ دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے طاغوت کی پیروی کی تھی حالانکہ ان کے پاس دین اللہ موجود تھا۔اگر چہ یہاں طاغوت کی غلامی کرنے والوں کی سزا کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تاہم یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ یہ دونو ں طبقات نہ صرف اللہ کی رحمت سے محروم ہوئے تھے بلکہ اُس کے غیظ وغضب کا بھی شکار ہوئے تھے۔

اس وقت مسلمان بھی دنیا بھر میں غضب الٰہی کا شکار اسی لئے ہورہے ہیں کہ اُنہوں نے احکامِ شریعت کو مسخ کردیا ہے اور یا پھر انہیں پسِ پشت ڈال کر عالمی طاغوتی نظام کا حصہ بن کر طاغوت کے بندے بن چکے ہیں۔ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر عملاً دین اللہ کے مطابق اپنے معاملات چلانے کی بجائے طاغوتی قوانین کے مطابق اپنا نظام مملکت چلا رہے ہیں جیسا کہ درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

" کیا آپ ﷺ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اُس پر جو آپ ﷺ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا تھا (اس کے باوجود) یہ چاہتے ہیں کہ معاملات کے فیصلے کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں تو حکم دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر گمراہی میں بہت دور لے جائے۔" (النساء ۶۰)

ظالم مسلمان بادشاہتوں کے دور میں دین اللہ کافی حد تک نافذ ہوا کرتا تھا لہذا فساد فی الارض بھی وسیع پیمانہ پر رونما نہیں ہوا کرتا تھا جبکہ مغربی سامراج کی براہ راست غلامی کے دور میں مسلمان

اقتدار سے محروم ہونے کی بناء پر دین اللہ کے نفاذ سے معذور تھے لہذا اُس دور کے مسلمانوں کو دین اللہ سے انحراف کے اتنے بڑے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا جتنا کہ موجودہ دور کے مسلمان ہیں جو اس وقت دوسری اقوام کے براہ راست غلام نہ ہونے کے باوجود بھی دین اللہ سے انحراف و سرکشی کے باعث طاغوت کی بندگی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اسی لئے مسلسل غضبِ الٰہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

موجودہ عالمی طاغوتی نظام کا سرخیل امریکہ ہے اور اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت بلواسطہ طور پر اُس کے طاغوتی نظام کی سیاسی و ذہنی غلامی میں گرفتار ہو چکی ہے اور یہ دراصل وہی غلامی والی بادشاہت ہے جس کا ذکر حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں کیا گیا ہے۔ کم از کم مسلم ممالک کے حکمران طبقات کے متعلق تو یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ طاغوت کی بندگی میں مبتلا ہو چکے ہیں ۔ طالبان کا اصل کارنامہ اس طاغوتی نظام کو قبول نہ کرتے ہوئے اسے اپنے ملک میں نافذ نہ کرنا تھا جسے طاغوتی نظام کے علمبردار ممالک بالخصوص امریکہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے اس حکومت کو ختم کر کے دم لیا ۔

چونکہ ہم نے طاغوتی نظام کے خلاف بغاوت کرنے والی طالبان حکومت کا ساتھ دینے کی بجائے طاغوتی قوتوں کا ساتھ دیا لہذا ہم عذاب الٰہی کے مستحق قرار پائے جیسا کہ درج درج ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے:

"اور یقیناً ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول (یہ حکم دیکر) بھیجا کہ بندگی کرو اللہ کی اور اجتناب کرو طاغوت (کی بندگی) سے، پس اُن میں سے کچھ ایسے تھے جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اُنہی میں سے کچھ ایسے تھے جن پر گمراہی مسلط ہو گئی، پس چلو پھرو زمین میں، پھر دیکھو کہ کیا انجام ہوا (دین اللہ کو) جھٹلانے والوں کا۔" (النحل ۳۶)

ہمیں ہرگز اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ طالبان نے طاغوتی قوتوں کے آگے گھٹنے نہ ٹیک کر کوئی غلطی کی ہے بلکہ اُنہوں نے تو ذات باری تعالیٰ پر کامل توکل کرتے ہوئے اپنی مدد کے لئے ایک ایسا سہارا حاصل کر لیا ہے جو تمام سہاروں سے بڑا سہارا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات قرانی میں فرمایا :

۱۱ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے صاف طور پر الگ ہو چکی ہے، پس جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر (کما حقہ) ایمان لایا تو یقیناً اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اللہ تو اُن لوگوں کا حامی و مددگار ہے جو (اُس پر کامل) ایمان لاتے ہیں، وہ اُنہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور وہ لوگ جو (دین اللہ کا) انکار کرتے ہیں، اُن کے حامی و مددگار طاغوت ہیں جو اُنہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف نکالتے ہیں، یہی لوگ اہل دوزخ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔" (البقرۃ ۲۵۶۔۲۵۷)

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روشنی صرف اور صرف اللہ کے دین میں ہے۔ جس روشن خیالی کا آج ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو اُس کی طرف بلایا جا رہا ہے، وہ محض تاریکی ہے اور اس تاریکی کی طرف دھکیلنے کا مقصد مسلمانوں کو طاغوتی قوتوں کا مکمل پیروکار اور دین اللہ سے گُلیتا باغی بنانا ہے۔

متیٰ نصر اللہ (اللہ کی مدد کب آئے گی؟)

درحقیقت اُمت مسلمہ مجموعی طور پر اِن دِنوں تقریباً انہی حالات سے دوچار ہے جس سے بنی اسرائیل کو فرعونِ مصر کی غلامی کے آخری دنوں میں پالا پڑا تھا۔ جبکہ مجاہدین اسلام اس وقت تقریباً انہی حالات کا سامنا کر رہے ہیں جن سے حضور اکرمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ غزوۂ احد سے لے کر غزوۂ احزاب تک کے دِنوں کے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے۔

اب یہ حالات کب تک رہیں گے؟ اور اللہ کی نُصرت کب آئے گی؟ اس کا قطعی علم تو ذاتِ باری تعالیٰ کے پاس ہی ہے تاہم تاریخ بنی اسرائیل کے تناظر میں قران وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات اُسی وقت تبدیل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت اُسی وقت آئے گی۔

(۱) جب مجاہدین اسلام ہر ممکن حد تک استقامت و ثابت قدمی کا مظاہرہ کر چکے ہوں گے جیسا کہ درج ذیل آیات باری تعالیٰ سے معلوم ہوتا ہے:

" (اے ایمان والو!) کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (بآسانی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ تمہیں ابھی اُن لوگوں کے سے احوال پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، انہیں (بھی) تنگ دستی اور مصیبت والم پہنچے اور وہ ڈول کر رہ گئے حتیٰ کہ (اللہ کا) رسول اور وہ لوگ جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، پکار اُٹھے! اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ (جواب دیا گیا) آگاہ ہو جاؤ! اللہ کی مدد آیا ہی چاہتی ہے۔" (البقرۃ ۲۱۴)

" کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں (یونہی) داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے جہاد کیا (اللہ کی راہ میں) اور وہ (یہ بھی) دیکھنا چاہتا ہے کہ ثا بت قدم رہنے والے کون ہیں؟" (آل عمران ۱۴۲)

(۲) جب امت مسلمہ کے اندر پائے جانے والے منافقین کا چہرہ اچھی طرح بے نقاب ہو چکا ہو گا جیسا کہ درج ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے:

"اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ مومنوں کو اس حالت میں چھوڑ دے جس میں وہ اس وقت ہیں حتیٰ کہ الگ نہ کر دے ناپاک کو پاک سے۔" (آل عمران ۱۷۹)

درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل ضابطہ و قانون رہا ہے کہ وہ مختلف مواقع پر اہل ایمان اور منافقین کے درمیان تفریق و امتیاز کیلئے سازگار حالات و اسباب پیدا کرتا رہتا ہے تاکہ نہ صرف اہل ایمان کی ثابت قدمی کا پتہ چل سکے بلکہ منافقین کے نفاق کا پردہ بھی چاک ہو سکے جیسا کہ درج ذیل آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے:

" کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض (یہ) کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے؟ اور (یہ کہ) انہیں فتنہ میں نہیں ڈالا جائے گا اور یقیناً ہم نے اُن لوگوں کو بھی جو ان سے پہلے تھے، فتنہ میں ڈالا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ ضرور دیکھ کر رہے گا اُن لوگوں کو جو (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں اور وہ ضرور دیکھ کر رہے گا اُن لوگوں کو بھی جو (اپنے دعویٰ ایمان میں) جھوٹے ہیں۔" (العنکبوت ۲۔۳)

' فتنہ ' کا مطلب ہی جانچ اور پرکھ کرنے والی ' کسوٹی ' ہوتا ہے اور لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کا مقصد اُن کے مابین تفریق و امتیاز (polarization) کرنا ہی ہوتا ہے۔

(۳) جب دشمنانِ اسلام اور ان کے ہمنوا نام نہاد مسلمان حکمرانوں پر اتمام حجت ہو چکا ہو گا۔ یعنی جب ان کا باطل پر اقرار اور حق پر انکار آخری درجے پر پہنچ چکا ہو گا اور اصلاح احوال کی

امیدیں بالکل دم توڑ چکی ہوں گی جیسا کہ درج ذیل آیت قرانی سے معلوم ہوتا ہے:

"اور آپ ﷺ کا پرودگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کر ڈالے جب کہ وہاں کے رہنے والے (اپنی) اصلاح کرنے والے ہوں۔" (سورۃ ہود ۱۱۷)

(۴) جب خالصتا اقامت دین وغلبہء دین کے لئے قائم ہونے والی دینی جماعتیں باہم متحد ہو کر ایک ۱۱ الجماعۃ ۱۱ کی صورت اختیار کر لیں گی جیسا کہ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ایک حدیث مبارکہ کے الفاظ ۱۱ یداللہ علی الجماعۃ ۱۱ (اللہ کا ہاتھ الجماعۃ پر ہے یعنی اسکی تائید ونصرت الجماعۃ کے ساتھ ہے) ، سے معلوم ہوتا ہے۔

الجماعۃ کی بہترین اور کامل شکل بلاشبہ جماعت صحابہ کرامؓ تھی جس کا مقصد دین اللہ کی نصرت تھا۔ آج کے دور میں الجماعۃ سے مراد وہ تمام جماعتیں ہوسکتیں ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف خدمت دین ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی جماعت کامل الجماعۃ کی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ کامل الجماعۃ وہی ہوسکتی ہے جسے اہل ایمان کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو اور اس کے فیصلوں کو اُمت کے اندر اجماع کا درجہ حاصل ہوسکے۔ نیز وہ الجماعۃ ایک متفق علیہ امیر کی قیادت میں متحد بھی ہو۔

اگر خدمت دین کے حوالہ سے سرگرم عمل اہم دینی جماعتیں باہم متحد ہو کر ایک الجماعۃ کی شکل اختیار کر لیں اور ایک ہی لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے اور ایک متفق علیہ شخص کی بیعت سمع وطاعت فی المعروف کرتے ہوئے نصرت دین کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیں تو وہ انشاءاللہ نصرت الٰہی کی سزاوار بن جائیں گی اور اس نصرت الٰہی کی بناء پر وہ دین اللہ کو نہ صرف قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی بلکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرنے کے مشن کی طرف عملی پیشرفت کا آغاز بھی کر دیں گی۔

سورہ آل عمران کی آیات ۸۱ تا ۸۲ میں رسولوں سے جس عہد کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کا مقتضاء ومنشاء بھی مرکزیت کا قیام ہے کہ اگر ایک وقت میں ایک سے زائد رسول مبعوث کر دیئے جائیں تو انہیں بھی اپنے میں سے ایک رسول کی اطاعت پر کاربند ہو کر مرکزیت قائم کرنا پڑے گی۔

یقیناً کلام اللہ کے حقیقی مخاطب اہل یمان ہیں جن سے انصار اللہ بننے کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے لہذا ان انصار اللہ کا باہم متحد ہو جانا ہی انہیں اللہ کی نصرت خصوصی کا حقدار بنا سکتا ہے۔

پس جب مذکورہ بالا تمام شرائط پوری ہو چکیں گی تو دُشمنانِ اسلام اور منافقینِ اسلام خسف، مسخ، سنگ باری، اور سُرخ آندھیوں وغیرہ کے عذاب ہائے الٰہی کا شکار ہو کر باقی دنیا کے لئے نشانِ عبرت بن جائیں گے جبکہ مجاہدینِ اسلام نصرت الٰہی کے ان واقعات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے غلبۂ اسلام کی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ العزیز۔

نیویارک اور کیلی فورنیا پر عذاب الٰہی کے سائے

طالبان کے امیر المومنین مُلا عمر مجاہد دامت برکاتہ نے سقوطِ قندھار کے دنوں میں بی بی سی لندن کی پشتو سروس کو دیئے گئے انٹرویو میں پیش گوئی کی تھی کہ **"عنقریب امریکا تباہ ہو جائے گا اور اپنی تباہی کا منظر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔"**

راقم کے خیال میں امریکا پر یہ تباہی دراصل خسف بالمغرب کے عذاب کی شکل میں نازل ہوگی۔

ملا عمر مجاہد کی پیشگوئی، قصہء فرعون اور دیگر آثار وقرائن کے تناظر میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''خسف بالمغرب'' کے عذاب کا مستحق فرعونِ عصر یعنی امریکہ ہی ہے اور اس کے امکانات امریکہ کی دو اہم ریاستوں ''نیویارک'' اور ''کیلی فورنیا'' میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

۱۱ ستمبر کا 'عذابِ ادنیٰ' اگرچہ امریکہ کے معاشی دارالحکومت یعنی نیویارک میں ہی اس کے زیادہ امکانات ظاہر کرتا ہے جہاں اقوام متحدہ کے دفاتر کے علاوہ ورلڈ بینک اور آئی۔ایم۔ایف جیسے استحصالی مالیاتی اداروں کے دفاتر بھی موجود ہیں۔

تاہم راقم کے خیال میں اس کے امکانات ریاست کیلی فورنیا میں اس سے بھی زیادہ پائے جاتے ہیں اور اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

(۱) اپنی سونے کی کانوں کی وجہ سے گولڈن سٹیٹ (Golden State) کہلانے والی امریکہ کی یہ ریاست امریکہ کی خوشحال ترین اور گنجان ترین آبادی والی ریاست ہے جس کے مشہور ترین شہر لاس اینجلس، سان فرانسسکو اور آک لینڈ وغیرہ ہیں۔

(۲) امریکی تہذیب وتمدن وترقی کے نشانات (Symbols) مشہور عالم، ہالی وڈ (Holly Wood)، ڈزنی لینڈ (Disney Land) اور گولڈن گیٹ برج (Golden Gate Bridge) جن پر امریکی قوم بے حد ناز رکھتی ہے، اسی ریاست میں واقع ہیں۔

(۳) کیلی فورنیا کو ماہرینِ ارضیات زلزلوں کے امکانات والے خطے میں شمار کرتے ہیں اور بار ہا یہ ریاست زلزلوں کا شکار ہو چکی ہے۔ وہاں لینڈ سلائیڈنگ کے واقعات اکثر وبیشتر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ مزید برآں اس ریاست میں واقعہ لاسن پیک نامی آتش فشاں پہاڑ (Lassen Peak Volcano) کسی بھی وقت پھٹ کر وسیع پیمانے پر تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔

(۴) کیلی فورنیا کا علاقہ سونامی کے خطرات سے بھی دوچار ہے۔ 1964ء میں ریاست الاسکا میں آنے والے تباہ کن سونامی نے ریاست کیلی فورنیا کو بھی متاثر کیا تھا۔

(۵) ایک اخباری اطلاع کے مطابق بحرِ ہند کے حالیہ سونامی کے نتیجہ میں کیلی فورنیا کے علاقہ میں زیر زمین پانی کی سطح پہلے سے بلند ہوگئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ باذن الٰہی یہ سطح اس قدر بلند ہو جائے کہ خسف بالمغرب کے واقعہ کا سبب بن جائے۔

(۶) نیویارک کی طرح سرمایہ دار یہودی طبقہ اس ریاست میں بھی کثیر تعداد میں آباد ہے جسے بلاشبہ یہودیوں کا 'قارونی طبقہ' قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ریاست کی تباہی درحقیقت امریکہ کی معاشی تباہی کے مترادف ہوگی اور یہ معاشی تباہی امریکہ کی کلی تباہی پر منتج ہوسکتی ہے۔

(۷) کیلی فورنیا کی ریاست ہم جنس پرستی کے حوالے سے بھی خاص شہرت رکھتی ہے اور یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ قوم لوطؑ پر عذاب ہم جنس پرستی کی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہی آیا تھا

۔اس عذاب کے نتیجہ میں انکی بستیاں بحیرہ مردار میں غرق کردی گیئں تھیں۔

(۸) 2004ء کے الیکشن میں صدر بش کو فیصلہ کن برتری اسی ریاست سے حاصل ہوئی۔ گویا اس ریاست کے عوام صدر بش کی ظالمانہ اور دہشت گردانہ پالیسیوں کی فیصلہ کن توثیق کر کے خود کو عذاب الٰہی کا مستحق بنا چکے ہیں۔راقم کے خیال میں یہ نکتہ اہم ترین اور فیصلہ کن ہے۔

امریکہ پر نازل ہونے والے عذاب الٰہی کی ایک ممکنہ صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی بڑا شہاب آسمان سے گر کر خسف بالمغرب واقعہ کا سبب بن جائے کیونکہ ماہرینِ فلکیات بھی ایک بہت بڑے (نوکلومیٹر لمبے) شہاب کے زمین پر گرنے کا امکان ظاہر کر چکے ہیں۔

امریکی خلائی شٹل ''کولمبیا'' کا تباہ ہو کر زمین پر گرنا غالباً اسی ممکنہ آسمانی آفت کے نزول کی طرف اشارہ کرتا ہے جبکہ قرآن کریم کی یہ آیت بھی اسی اَمر کی تصدیق کرتی ہے:

اَفَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ/ وَمَا خَلۡفَهُمۡ/ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ط/ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ/ اَوۡ نُسۡقِطۡ

عَلَیۡهِمۡ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ط/ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ/ (۹)

'' تو کیا یہ لوگ ان چیزوں کی طرف نہیں دیکھتے جوان کے آگے اور جواُن کے پیچھے ہیں (مثلاً) آسمان اور زمین، اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں، بلاشبہ اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لئے جو (اپنے رب کی طرف) رجوع کرنے والا ہو''۔ (سورۂ سبا ۹)

یہ بھی ممکن ہے کہ امریکی خلائی ادارے ناسا (NASA) کے دُمدار ستاروں سے راکٹ ٹکرانے کے حالیہ یا مستقبل کے تجربات ہی آسمانی آفت کے نزول کا ذریعہ بن جائیں۔

مزید برآں ویتنام میں امریکی شکست، لبنان وصومالیہ میں جارحیت کے بعد وہاں سے امریکہ کا فرار ہونا، افغانستان اور عراق میں جاری تحاریکِ مزاحمت، اور ان کے نتیجے میں امریکی افواج کے گرتے ہوئے مورال (Morale)، ڈالر اور یورو یا بالفاظ دیگر امریکہ و یورپ کی باہمی آویزش، امریکہ اور چین کی باہمی کشاکش اور ان سب سے بڑھ کر وہ یہودی ایجنڈا جس کے مطابق روس کی طرح امریکی زوال بھی بالآخر ناگزیر ہے، ایسے مزید آثار وقرائن ہیں جو مستقبل میں امریکی زوال کی طرف تو کم از کم واضح اشارہ کر رہی رہے ہیں۔لیکن بہت سی نشانیاں اور آثار دیکھنے کے باوجود فرعونِ عصر کے تکبر اور ظلم وستم میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

امریکی حکمران یہودیوں کے آلۂ کار بن کر اور اپنی قوم کو دیگر اقوام سے برتر قرار دے کر ''دہشت گردی کے خلاف مہم'' اور اپنی ''آزادی کے تحفظ'' کے نام پر اُسی طرح اپنی قوم کو بیوقوف بنا رہے ہیں جس طرح فرعونِ مصر نے اپنی قوم کو بنایا تھا۔

قرآنِ حکیم کی درج ذیل آیات ہو بہو امریکی صدر بش پر صادق آتی ہیں اور غالباً انہی آیات کے پیش نظر اُسامہ بن لادن نے امریکی صدر بش کو دنیا کا احمق ترین انسان قرار دیا تھا جو خود بھی احمق ہے اور اپنی قوم کو بھی اسی حماقت میں مبتلا کر رہا ہے:

فَاسۡتَخَفَّ قَوۡمَهٗ/ فَاَطَاعُوۡهُ ط اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ/ (۵۴) فَلَمَّاۤ اٰسَفُوۡنَا انۡتَقَمۡنَا/ مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (۵۵)

فَجَعَلۡنٰهُمۡ سَلَفًا / وَّمَثَلًا لِّلۡاٰخِرِیۡنَ (۵۶)

'' پس فرعون نے اپنی قوم کو بیوقوف بنایا تو وہ اس کی باتوں میں آ گئے۔یقیناً وہ لوگ فاسقوں کی قوم تھے پھر جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا اور ہم نے انہیں ایک گئی گزری (قوم) اور آخرین کے لئے ایک مثال بنا دیا۔''

(سورہ الزخرف ۵۴۔۵۶)

آیات درج بالا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو آخرین کے لئے مثال بنانے کا مطلب آخری زمانے کے فرعون یعنی فرعونِ حاضر کے لئے سبق آموز بنانا تھا۔لیکن سب سے بڑی اور تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ انسان نے تاریخ سے آج تک کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو بار بار دہراتی رہی ہے۔آیات درج بالا بھی میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں کہ خسف بالمغرب کا عذاب ریاست کیلیفورنیا پر ہی نازل ہوگا جہاں کے عوام نے صدر بش کے جھوٹے پراپیگنڈہ کا شکار ہو کر اسے دوبارہ کامیاب کروانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔

یہاں کچھ لوگوں کے ذہنوں میں اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون کو تو سمندر میں غرق کیا گیا تھا جبکہ ہم فرعونِ حاضر کو خسف کے عذاب کا مستحق ثابت کر رہے ہیں۔ہمیں جان لینا چاہئے کہ غرق اور خسف میں حقیقت کے اعتبار سے زیادہ فرق نہیں۔

کرۂ ارض کا بیشتر حصہ سمندر ہے لہٰذا دھنسنے والی زمین بھی درحقیقت سمندر ہی میں غرق ہو جایا کرتی ہے جیسا کہ 28 مارچ 1964ء کو امریکہ ہی کی ریاست الاسکا میں آنے والی سونامی کے نتیجہ میں اس کے کچھ ساحلی علاقے سمندر میں دھنس کر غرقاب ہو گئے تھے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ امریکی قوت وترقی کا بنیادی سبب اُس کی معیشت ہے اور اس کی معاشی تباہی کے بغیر اسے کمزور یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔افغانستان اور عراق میں جاری جنگوں کے باوجود اس کی معیشت اب تک ڈانواں ڈول نہیں ہوسکی ہے۔لہٰذا اسکے کسی امیر ترین علاقے کی تباہی ہی اسے حقیقی تنزل وتباہی سے دوچار کر سکتی ہے اور ایسا یقیناً اس کی دو اہم ترین ریاستوں

'نیویارک' اور 'کیلی فورنیا' میں سے ایک یا پھر دونوں کی تباہی کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ ایسا لازماً ہو کر رہے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(باب پنجم)

خسف بالمشرق کے اسباب واثرات

خسف بجزیرۃ العرب اور خسف بالمغرب کے برعکس خسف بالمشرق کا مسئلہ راقم کے نزدیک کافی پیچیدہ اور نہایت غور طلب ہے۔ خسف بالمشرق کے اسباب کو قارونیت یا فرعونیت کی طرح کسی ایک ہی فتنہ سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ مشرق کی کسی سرزمین پر واقعۂ خسف پیش آنے کی کئی وجوہات ہوں گی۔ درج ذیل نکات کے تحت کی جانے والی بحث اور اس کے نتیجہ سے قارئین خسف بالمشرق کی حقیقت کا کافی حد تک احاطہ کر سکتے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ قارئین کی اکثریت میری اس طویل بحث اور اس سے اخذ ہونے والے نتائج سے متفق ہوگی۔

اس بحث کا پہلا نکتہ بہت سے قارئین کے لئے نیا نہیں ہوگا کیونکہ اس کی کسی قدر وضاحت محترم ڈاکٹر اسرار احمد پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس اہم نکتہ کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) آیات اللہ سے روگردانی

اہلِ علم کے طبقہ میں اس بات پر تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے بعد اسلام کی زیادہ تر تجدیدی واحیائی مساعی برصغیر پاک وہند میں ہی کی گئی ہے۔ چنانچہ گیارہویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی (دوسرے ہزار سال کے مجدد)، بارہویں صدی کے مجدد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، تیرہویں صدی کے مجدد سید احمد شہیدؒ جن کے دست راست شاہ ولی اللہؒ کے پوتے حضرت شاہ اسماعیلؒ تھے، اسی سرزمین ہندوستان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے بت کدۂ ہندوستان میں اسلام کے ٹمٹماتے ہوئے دیے کو روشن کئے رکھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد یہاں مولانا قاسم نانوتویؒ کے ہاتھوں ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا جس نے ایک عظیم الشان مکتبۂ فکر کو جنم دیا اور اس مکتبۂ فکر کا کردار برصغیر کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس مکتبۂ فکر کا اہم ترین کارنامہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی حفاظت کے علاوہ برصغیر پاک وہند میں بڑھتے ہوئے فرقہ واریت کے سیلاب کے آگے ایک مضبوط بند باندھ کر اعتدال پسندی کو فروغ دینا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی دارالعلوم دیوبند سے چودھویں صدی کے مجدد حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، (پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام)، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، جیسے اعاظم رجال پیدا ہوئے۔ اور اسی مسلک دیوبند سے قرب رکھنے والے مولانا ابوالکلام آزادؒ اور جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالعلیٰ مودودیؒ جیسے سیاسی رہنما بھی پیدا ہوئے جن کی سیاسی وفکری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے تبلیغی جماعت جیسی عظیم الشان اسلامی تحریک کی ابتداء کی جو اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی تحریک وجماعت کہی جا سکتی ہے۔

برصغیر پاک وہند کی سرزمین سے ہی تحریک خلافت کے رہنما مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا شوکت علی خاںؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور پان اسلام ازم تحریک کے بانی مولانا جمال الدین افغانیؒ جیسے عظیم رہنما پیدا ہوئے۔

اسی دھرتی نے علامہ محمد اقبالؒ جیسا عظیم مفکر وشاعر پیدا کیا جس نے نہ صرف اپنی ایمان افروز شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کی تجویز بھی پیش کی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کو لندن سے واپس بلا کر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کا مشورہ بھی علامہ اقبال نے ہی دیا تھا۔

''دوقومی نظریہ'' بھی اسی سرزمین میں پروان چڑھا اور ہم سب جانتے ہی ہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے اور قیام پاکستان میں اسی ''نظریہ'' نے بنیادی اور حتمی کردار ادا کیا۔

۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے نتیجہ میں جب مسلمانانِ ہند کی جدوجہد وقربانیوں کے نتیجہ میں ۱۹۴۷ء میں اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آگیا تو اس کی دستور ساز اسمبلی نے 1949ء میں ''قرارداد مقاصد'' جیسی عظیم الشان قرارداد پاس کی جس میں واضح طور پر اقتدار اعلیٰ کا مالک ذاتِ باری تعالیٰ کو تسلیم کیا گیا تھا۔ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کی یہ واحد اور منفرد قرارداد تھی جس نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ اور دنیا میں احیاء اسلام کی قوی امید پیدا کر دی تھی۔ یہ قرارداد پاکستان کے ہر آئین کا دیباچہ بھی قرار پائی۔

پاکستان ہی میں تحریک ختم نبوت برپا کی گئی جس کے نتیجہ میں نہ صرف بالآخر گمراہ ''قادیانی فرقہ'' کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا بلکہ عقیدہ ختم نبوت ورسالت کی حفاظت کا عظیم الشان کام بھی سرانجام دیا گیا۔

اسی ارض پاکستان نے جہاد افغانستان میں ''فرنٹ لائن اسٹیٹ'' کا کردار ادا کیا جس کی وجہ سے نہ صرف افغانستان آزاد ہوا بلکہ سوشلزم اور کمیونزم کے علمبردار سوویت یونین کے حصے بخرے بھی ہوگئے۔

اسی ملکِ پاکستان کی ''سپریم کورٹ'' نے 'سود' جیسی عظیم لعنت کو حرام قرار دے کر بنکنگ کے موجودہ عالمی استحصالی نظام کے خلاف ایک تاریخی فیصلہ سنایا۔

یہی وہ پہلا اور آخری مسلم ملک ہے جس نے ایٹمی طاقت بننے کا اعزاز حاصل کیا اور اس کے ایٹم بم کو 'اسلامی بم' قرار دے کر اسے پوری مغربی دنیا کے لئے خطرہ قرار دیا گیا۔

اور یہی وہ وطن عزیز ہے جہاں سب سے زیادہ دینی، اصلاحی اور جہادی تحاریک موجود ہیں جن کی دینی کاوشوں کی وجہ سے یہاں اسلام کا شعور، مذہبی وابستگی اور عالمِ اسلام سے ہمدردی کا جذبہ دیگر تمام مسلم ملکوں سے زیادہ پایا جاتا ہے اور انہی تمام وجوہات کی وجہ سے عالمِ کفر کی نظروں میں یہ ملک سب سے زیادہ کھٹکتا ہے۔

لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تحریک پاکستان کا اہم ترین نعرہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ ہی تھا؟

کیا اس نعرے کے ذریعے ہم نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد نہیں کر لیا تھا کہ آزادی کے
بعد ہم ارضِ پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنائیں گے؟
کیا ہم نے اپنا یہ عہد پورا کر دیا ہے؟
کیا یہ حقیقت نہیں کہ بادلِ نخواستہ ''قراردادِ مقاصد'' کو پاس کر لینے کے بعد اس سے انحراف وفرار کی ہر ممکن راہ تلاش کی گئی جس کا سلسلہ اب اپنی آخری حدوں کو چھو رہا ہے؟
ہم نے جو آئین بھی مرتب کیا، اس میں ''قراردادِ مقاصد'' کو ''تبرکاً'' تو ضرور شامل کیا مگر اس کی اکثر دفعات کو ناقابلِ عمل قرار دے کر معطل یا مؤخر کر دیا۔
چونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ سے کئے گئے عہد سے فرار کی راہیں تلاش کیں لہٰذا از روئے قرآن (سورۃ التوبہ ۷۷۔۷۵) اللہ تعالیٰ نے ہمارے دلوں میں نفاق کا مرض پیدا کر دیا۔
نفاق کی نشانیاں از روئے حدیث بدعہدی، امانت میں خیانت، جھوٹ بولنا اور لڑائی جھگڑا کے موقع پر گالی گلوچ کرنا ہے۔ (عن عبداللہ بن عمروؓ رواہ بخاری)
کیا اس وقت ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی درجہ میں اس مرضِ نفاق میں مبتلا نہیں ہے؟

ہمارے سیاسی رہنماؤں نے آزادی کے بعد اخوتِ اسلامی کے جذبہ کو بیدار کرنے کی بجائے اپنے مفادات کی خاطر نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصّبات کو ہوا دی۔ ہمارے حکمرانوں نے ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی بجائے امریکہ و یورپ سے تقرب، ان کی رضا جوئی اور ان سے مفادات کے حصول کے لئے ملک میں اسلامی اقدار و روایات کی حوصلہ شکنی کی اور ملک میں سیکولرازم (لادینی نظامِ حکومت) کو رائج کرنے کی کوششیں کیں۔ اسکی نمایاں ترین مثال صدر ایوب کے دور میں نافذ ہونے والے غیر اسلامی عائلی قوانین تھے جو ابھی تک نافذ ہیں حالانکہ ان قوانین کو تبدیل کرنے کی ہمت انگریز کو بھی نہ ہوئی تھی جبکہ موجودہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ان قوانین کو تبدیل کرنے کی حکومتی کوششوں کو بزورِ احتجاج ناکام بنا دیا تھا۔

ہم نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو برابر کے بھائی سمجھنے کی بجائے ان کے جائز حقوق سلب کرتے ہوئے اُن کا نہ صرف استحصال کیا بلکہ خون بہانے سے بھی گریز نہ کیا۔

ان سب جرائم کے نتیجہ میں بالآخر 1971ء میں ہم پر عذابِ الٰہی کا کوڑا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں برسا۔ ہمارے ترانوے ہزار فوجی اس دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے جس پر ہم نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی۔ اس شکست کی وجہ سے ہمارے ''دوقومی نظریہ'' پر کاری ضرب پڑی کیونکہ ہم نے مشرقی پاکستان میں اپنے ہی ہم مذہب و ہم قوم افراد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر لئے تھے۔ اور اسی وجہ سے اِندرا گاندھی کو کہنے کا موقع ملا تھا کہ ''ہم نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے'' اور یہ کہ ''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا ہے۔''

اس عظیم سانحہ کے بعد ہم نے 1973ء میں پھر ایک ''نام نہاد اسلامی آئین'' مرتب کیا مگر اس کی اکثر اسلامی دفعات کو پھر عملاً معطل یا مؤخر کر دیا۔ بھٹو حکومت نے اگرچہ عقیدۂ ختم نبوت کو قانونی شکل دینے کا کارنامہ سرانجام دیا مگر عملاً ملک میں خلافِ اسلام روایات و اقدار کو پروان چڑھانے کی کوششیں کیں اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا۔

اس کے بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلامی اقدار و روایات کی اگرچہ قدرے حوصلہ افزائی کی گئی جس کی ایک مثال ۱۹۷۹ء میں حدود قوانین کا نفاذ تھا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں اسلام کا نام اقتدار کو طول دینے کے آلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

جہاد افغانستان میں حصہ لے کر اگرچہ مسلمان افغان بھائیوں کی مدد کے علاوہ پاکستان کے تحفظ کو بھی ممکن بنایا گیا تاہم اسی جہاد کی آڑ میں بعض جرنیلوں اور موقع پرست جہادی تنظیموں نے غیر ملکی امداد کے مزے بھی خوب خوب لوٹے۔

قوم کو ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کے تحفوں کے علاوہ لسانی و صوبائی تعصّبات کو ہوا دینے والے نئے رہنما بھی اسی دور میں میسر آئے۔

کرکٹ ڈپلومیسی وغیرہ پالیسیوں سے اگرچہ بھارت کی طرف سے جارحیت کے خطرہ کو ٹال دیا گیا تھا تاہم ''سیاچین'' کے علاقہ پر بھارتی قبضہ کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا گیا۔

اس کے بعد ''بے نظیر'' اور ''نواز شریف'' کا وہ نام نہاد جمہوری دور آیا جس میں سیاسی بدعنوانیوں، ہارس ٹریڈنگ، فلور کراسنگ اور ضمیر فروشی کے نت نئے ریکارڈ قائم کئے گئے۔

اس دور میں بھی ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے بلند بانگ دعوے اور وعدے تو ضرور کئے گئے مگر نتیجہ صفر کا صفر ہی رہا۔ چنانچہ سود کے خلاف سپریم کورٹ کے تاریخی فیصلے کو پسِ پشت ڈال کر اس کے خلاف اپیلیں بھی دائر کی گئیں۔

اس دور میں پاکستان ایک ایٹمی قوت تو ضرور بن گیا مگر اس کے فوراً بعد کارگل کے محاذ پر پسپائی اختیار کرتے ہوئے اور شملہ معاہدہ سے ایک قدم اور بڑھ کر کنٹرول لائن کے تقدس کو تسلیم کر کے یک طرفہ ''معاہدہ واشنگٹن'' کا طوق بھی گلے میں پہن لیا گیا۔

سب سے آخر میں وہ دورِ آمریت شروع ہوا جسے پاکستان کی تاریخ کا بدترین دور کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت جنرل پرویز مشرف کو برسرِ اقتدار آنے کا موقع دینے والے خود ہمارے عاقبت نااندیش سیاست دان ہی تھے جنہوں نے ماضی کے تلخ تجربات کے باوجود سیاسی معاملات میں فوج کو دخل اندازی کی دعوت دی تھی اور اسی سے شہ پا کر جنرل پرویز مشرف نے برطرف ہو جانے کے باوجود اقتدار پر قبضہ کر کے ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔

پرویز مشرف نے کارگل جنگ کے دوران امریکی جنرل زینی کے ساتھ ملاقات میں اسے اپنی روشن خیالی کا قائل کر لیا تھا لہٰذا مشرف صاحب کا عنانِ اقتدار سنبھالنا اور اس پر اب تک فائز رہنا بھی امریکی آشیر باد کا ہی مرہون منت ہے۔ یوں تو پاکستان کی مسلح افواج میں امریکی اثر و رسوخ شروع ہی سے چلا آ رہا ہے تاہم اب تو یہ اپنی آخری حدوں کو چھو چکا ہے۔ اس امریکی اثر و رسوخ کی وجہ سے ملکی

سیاست میں مسلح افواج کے باقاعدہ قانونی کردار کا نظریہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ ترکی کی طرح پاکستان کی سیاست میں بھی فوج کا عمل دخل مستقل بنایا جاسکے اور جونہی بنیاد پرست عناصر کے برسرِ اقتدار آنے کا امکان ہو تو فوج مداخلت کر کے اسے بزورِ قوت ختم کر ڈالے۔ ''نیشنل سیکیورٹی کونسل'' کا قیام اسی پالیسی اور مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا ہے۔

جنرل پرویز مشرف نے ایک ایسے ریفرنڈم کے ذریعے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا جس میں خود ان کی زبانی بے قاعدگیاں ہوئی تھیں۔ مشرف صاحب نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے بلدیاتی انتخابات کے ذریعے پہلے اپنے حمایتیوں کا ٹولہ پیدا کیا۔ بعدازاں نام نہاد قائداعظم لیگ کے عنوان سے ابن الوقت اور مفاد پرست سیاستدانوں کی ایک جماعت بھی قائم کروادی۔ پھر اسی جماعت کو مختلف غیر قانونی ہتھکنڈوں کے ذریعے انتخابات میں کامیاب بھی کروادیا گیا۔ پھر ہارس ٹریڈنگ اور فلور کراسنگ کے ذریعے اپنی من پسند حکومت بھی قائم کردی گئی جس میں مختلف مقدمات میں ملوث افراد کو بھی وزارتیں اور عہدے الاٹ کردیئے گئے۔ پارلیمنٹ کو ربڑ سٹیمپ بنا کر اپنے من پسند قوانین اور بل پاس کراوئے گئے۔

اگر کچھ لوگوں نے جنرل صاحب کی منشاء کے مطابق عمل نہ کیا تو انہیں ان کے عہدوں سے فارغ کردیا گیا تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

2004ء کے آخر تک وردی اتار دینے کا وعدہ کر لینے کے باوجود اس وعدہ کو ایفاء نہ کر کے اور اس وعدہ خلافی کو پارلیمنٹ کے ذریعے غیر آئینی جواز عطا کر کے جنرل پرویز مشرف اور ان کے حمائتی ٹولہ نے سرکاری طور پر یہ بات ثابت کردی کہ ہم بحیثیت مجموعی ایک عہد شکن اور نفاق کے مرض میں مبتلا قوم ہیں۔

ہمارے صدر صاحب کے مزید کارناموں میں شرعی احکامات و تعزیرات کا مذاق اڑانا، قوم کو جدت پسند اور روشن خیال بننے کے وعظ کہنا، نظامِ تعلیم و نصابِ تعلیم کو آغا خان بورڈ کے ذریعے سیکولرائز کرنے کی کوششیں کرنا، دینی مدارس و مساجد پر انتہا پسندی کے خاتمے کے نام پر کریک ڈاؤن کرنا، ذرائع ابلاغ کے ذریعے فحاشی و عریانی کی کھلی چھٹی دینا، ہندوستانی و مغربی تہذیب و ثقافت کی ''بسنت'' اور ''سپورٹس'' کے نام سے سرکاری سرپرستی کرنا۔ دوقومی نظریے کے منکرین و مخالفین کی سرکاری سرپرستی کرنا جبکہ متحدہ قومیت یا مشترکہ قومیت و ثقافت کے علمبرداروں کی حوصلہ افزائی کرنا، جہادِ کشمیر کو دہشت گردی قرار دے کر اس مسئلہ پر بھارت و امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششیں کرنا، اور مسئلہ کشمیر کے ہر اس حل کے لئے تیار ہوجانا جو بھارتی حکومت کو منظور ہو اور پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے والے مُحسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے خلاف اہلِ مغرب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کاروائی کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

اس حکومت کے تازہ ترین سیاہ کارناموں میں حدود قوانین کا خاتمہ اور لال مسجد کے خلاف پراسرار ۱۱ آپریشن سائیلنس ۱۱ کو قرار دیا جاسکتا ہے جسے بلاشبہ پاکستانی تاریخ کے المناک ترین واقعات میں سے شمار کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ان سب مکروہ اور مذموم کارناموں میں سے عظیم ترین ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر اپنے پڑوسی اسلامی ملک افغانستان کے خلاف اتحادی افواج کا ساتھ دینا ہی ہے کیونکہ اس نعرے نے ہمیں ملتِ اسلامیہ سے کاٹ کر ایک خودغرض اور مفاد پرست قوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس نعرے کے ذریعے ہمارے ''دوقومی نظریہ'' کی نفی بھی ہوئی ہے۔ اسی نعرے کی وجہ سے ہم کشمیریوں سے بے وفائی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور یہی وہ نعرہ ہے جس کے ذریعے ہمیں عالم اسلام کے مسائل سے لاتعلق و غافل رہنے اور ان میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرنے کا سبق پڑھایا جارہا ہے۔ عراق کے بعد اب ایران پر متوقع امریکی حملے کی صورت میں اپنی غیر جانبداری کا قبل از وقت اعلان کر کے ہم نے اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

الغرض ہم من حیث القوم پستی اور تنزل کی طرف ہی بڑھتے چلے جارہے ہیں بالکل اُس شخص اور قوم کی طرح جس کا ذکر درج ذیل آیات قرآنی میں کیا گیا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا/ فَانْسَلَخَ مِنْهَا/ فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ/ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ/ (۱۷۵) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا/ وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ/ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ/ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ/ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ/ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ/ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ/ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ/ (۱۷۶) سَآءَ مَثَلَا نِ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا/ وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ/ (۱۷۷)

'' (اے نبیؐ) اور ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کیجئے جسے ہم نے اپنی کچھ آیات (نشانیاں) عطا کی تھیں مگر وہ ان (کی پابندی) سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کے ذریعے اسے بلندی عطا فرماتے مگر وہ تو زمین کی طرف ہی دھنستا چلا گیا۔ اور اس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی۔ پس اس کی مثال ایک کتے کی مانند ہوگئی۔ اگر اس پر بوجھ لادیں تب بھی زبان لٹکائے اور اگر اسے چھوڑ دیں تب بھی زبان لٹکائے۔ یہی مثال * اس قوم کی بھی ہے جس نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس یہ احوال (ان کے سامنے) بیان کریں شاید وہ (اس پر) کچھ غور و فکر کریں۔ بہت ہی بری مثال ہے اس قوم کی جس نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔''

(سورۃ الاعراف ۱۷۷۔۱۷۵)

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول آیاتِ درج بالا مکمل طور پر پاکستانی قوم پر ہی صادق آتی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کی شبِ قدر کو انگریز و ہندو کی دوہری غلامی سے معجزانہ انداز میں آزادی عطاء فرمائی۔ اور اسے دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست کا اعزاز عطا کیا۔

---

* اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی فرد کا کردار کسی قوم پر بھی منطبق ہوسکتا ہے۔ لہٰذا قارون، فرعون اور بلعم بن باعورہ کے کرداروں کو کتاب ھذا میں مختلف اقوام پر منطبق کرنے کی یہ ایک اہم قرآنی دلیل ہے۔

مشرقی ومغربی پاکستان کے مابین ایک ہزار میل کی دوری کے باوجود ان کا ایک متحدہ وفاق بننا ایک منفرد مثال تھی جبکہ قرارداد مقاصد کے ذریعے بھی پاکستان نے اپنی نوعیت کی واحد مثال قائم کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بہادری وشجاعت کی دولت بھی عطا کی تھی۔ جس کا اظہار ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کی جنگوں میں شاندار کارکردگی کی صورت میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں بھی صلاحیتوں (Talents) کی کوئی کمی نہ تھی۔ ان تمام صلاحیتوں کی وجہ سے اس بات کی قوی امید اور امکان پیدا ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے یہ ملک عالم اسلام کے لئے ایک رہنما مثال اور عملی نمونہ (Role Model) بن جائے گا۔

مگر یہ تو بتدریج پستی کی طرف ہی گرتا چلا گیا جس کا ایک اہم مظاہرہ ''معاہدہ تاشقند'' تھا جس میں انتہائی کمزوری وبزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارتی شرائط پر صلح کر لی گئی تھی اور کشمیر کے معاملہ کو پسِ پشت ڈال دیا گیا تھا۔ ہماری اس کمزوری وبزدلی کے مظاہرے نے ہی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی راہ ہموار کی تھی۔ قبل ازیں ۱۹۶۲ء کی بھارت چین جنگ کے دوران کشمیر کو آزاد کروانے کا سنہری موقعہ بھی ہم نے امریکی دباؤ اور بزدلی کی وجہ سے گنوا دیا تھا۔

سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد اگرچہ کچھ اچھے کام بھی ہوئے مثلاً اسلامی کانفرنس تنظیم کی میزبانی، جہادِ افغانستان اور طالبان حکومت کے قیام میں مدد دینا اور اسے تسلیم کرنا، ایٹمی دھماکوں کے ذریعے اپنی حربی صلاحیت کا مظاہرہ وغیرہ۔ لیکن ان دھماکوں کے کچھ ہی عرصہ بعد کارگل سے پسپائی اور معاہدۂ واشنگٹن پر دستخطوں نے ہمیں ایک بار پھر بزدل اور عالمِ اسلام میں قائدانہ کردار ادا کرنے سے معذور قوم بنا کر رکھ دیا۔ اب پرویز مشرف صاحب کے دورِ اقتدار میں طالبان کے ساتھ بے وفائی کے نتیجہ میں ہم جس پستی وتنزل کی کھائی میں گر پڑے ہیں، اس سے نکلنے کی کوئی امید بظاہر نظر نہیں آ رہی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے بہرہ مند نہ ہونے کے سبب ان سے محروم ہی ہوتے چلے گئے۔ چونکہ ہم نے خود ان نشانیوں کی ناقدری کی اور ان سے منہ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان نشانیوں کی قدر ومنزلت ہمارے دلوں سے نکال دی۔ سورۂ اعراف ہی کی درج ذیل آیت اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتی ہے:

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ‌ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَىِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ (۱۴۶)

۱۱ میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔۱۱ (اعراف ۱۴۶)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی نشانیوں کی وجہ سے ہمارا آغاز تو یقیناً بہت اچھا تھا۔ ہماری بلندی ورفعت کے امکانات تو بہت زیادہ تھے مگر ہم تو دن بدن زمین کی طرف ہی دھنستے چلے گئے اور بالآخر ''حف بالمشرق'' کے عذاب الٰہی کے متوقع امیدوار وسزاوار بن گئے جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہی اس کی خبر اس طرح دی گئی ہے:

وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۱۸۲) وَاُمۡلِىۡ لَهُمۡ‌ؕ اِنَّ كَيۡدِىۡ مَتِيۡنٌ (۱۸۳)

۱۱ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، ہم انہیں بتدریج لے جائیں گے (تباہی وہلاکت کی طرف) ایک ایسے طریقے سے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی اور میں ان کو ڈھیل دوں گا، بے شک میری چال بڑی مضبوط ہے۔۱۱ (سورہ اعراف ۱۸۳۔۱۸۲)

سورہ اعراف کی آیات ۱۷۷۔۱۷۵ کے حوالے سے کچھ باتیں مزید قابل غور ہیں مثلاً ان آیات میں بیان کی گئی ''کتے'' کی مثال کیا معانی رکھتی ہے؟ اور یہ کہ ان آیات میں بیان کئے گئے شخص کی حقیقت کیا ہے؟

اوّل الذکر کا مطلب یہ ہے کہ بالعموم کتا چونکہ مال برداری کے کام آنے والا جانور نہیں ہے اس لئے اگر اس کے اوپر کوئی بوجھ لاد دیا جائے تو وہ اسے اٹھانے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتا لہٰذا زبان نکال کر ہانپنے لگتا ہے۔ اس لئے بہت ہی مشکل ہے کہ وہ یہ بوجھ اٹھا کر اسے اس کی منزل تک پہنچا دے حالانکہ کتے کا مالک یہ سمجھتا ہے کہ اس کتے میں مطلوبہ بوجھ اٹھانے اور اسے منزل مقصود تک پہنچانے کی صلاحیت موجود ہے۔

ہم پاکستانیوں کے مالک وپروردگار نے ہمیں بے شمار نشانیوں وصلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اگر ہم ان صلاحیتوں کا اسلام کی خدمت کے لئے مثبت استعمال کرتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم عالم اسلام کی قیادت کے حقدار نہ بن جاتے۔ مگر ہم نے تو اسلام کو اپنے لئے ایک بھاری بوجھ خیال کرتے ہوئے اس سے جان چھڑانے اور راہِ فرار اختیار کرنے کی ہی تدبیریں سوچیں۔

لیکن اس کے باوجود ہمارے حکمران پاکستان کو ''اسلام کا قلعہ'' قرار دے کر عالم اسلام میں ایک اہم کردار ادا کرنے کے اُسی طرح خواہش مند ہیں جس طرح وہ کتا جس کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے کہ وہ بھاری بوجھ اپنی پیٹھ پر سے اتر جانے کے بعد پھر اسی ''بوجھ'' کو زبان لٹکا کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔

۲۶ مئی ۲۰۰۵ء کو ''واشنگٹن ٹائمز'' نامی امریکی میگزین میں مملکتِ خداداد پاکستان کے لئے کتے کی شکل کا کارٹون شائع ہونا پاکستانی قوم کے لئے باعثِ عبرت وموعظت ہے۔

لگتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ سزا دینے سے پہلے ہم پر اتمام حجت کا حق ادا کر رہی ہے تاکہ جب عذابِ الٰہی نازل کیا جائے تو ہم اپنے کرتوتوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔

مؤخر الذکر یعنی اُس شخص سے مراد کون ہے جس کا ذکر سورۂ اعراف میں کیا گیا ہے؟

تو یہ بات ہمارے لئے باعثِ حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ یہ شخص بھی دراصل ایک ''اسرائیلی کردار'' ہے جس کا نام ''بلعم بن باعورہ'' تھا۔ آثار و قرائن اور اپنی صلاحیتوں کے باعث وہ ایک بڑا پیشوا اور قائد بن سکتا تھا مگر وہ اپنی خواہشاتِ نفس کا ایسا اسیر ہوا کہ وہ اُن پابندیوں کو برداشت نہ کر سکا جن کی ایک حقیقی قائد و رہنما شخص کو ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجتاً اُسے ان تمام صلاحیتوں اور آیات اللہ سے محروم کر دیا گیا جو قبل ازیں اسے عطا کی گئی تھیں۔

ایک بھارتی مسلمان دانشور و محقق ''اسرار عالم'' جو اُمتِ مسلمہ کی حالتِ زار اور بالخصوص فتنۂ دجّال کے متعلق بہت سی تحقیقی کُتب کے مصنف ہیں، نے پاکستانی قوم کی اس حالت زار کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ کی مصلحتِ خاصہ کے تحت جس کو ''اجلِ اُمت'' بھی کہتے ہیں، فی زمانہ کسی خطے میں ایک تاریخی مدت تک غیر معمولی دانش وارانہ قوت و صلاحیت کی نمود ہوتی ہے۔ اُس خطے میں فی زمانہ بسنے والے افراد کے لئے یہ گھڑی فیصلہ کن اور آزمائش کی ہوتی ہے۔ وہ چاہیں تو اہلِ ثابت (اہلِ استقامت) ہو کر اللہ کے مزید انعامات کے مستحق ہو جائیں یا ان قوتوں کو ضائع کر کے خسران اٹھائیں۔ عصرِ حاضر میں پورے عالمِ اسلام میں سب سے زیادہ غیر معمولی دانش ورانہ قوت و صلاحیت کی نمود پاکستان میں نظر آتی ہے۔ لیکن گزشتہ پچاس سالوں کے دوران اس ''انعام خاص'' کے باوجود وہاں کے اکثر حکمران، علماء و مشائخ، دانشوران اور اعیان معاشرہ فی الواقع ''کوتاہ'' اور ''بے توفیق'' ثابت ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اس ''اجلِ اُمت'' کی ایسی بے توقیری کی اور اس غیر معمولی دانش ورانہ قوت کو اتنا ضائع اور پامال کیا جس کی نظیر حالیہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ کم سواد اور کم ہمت لوگ یہ دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا حاصل کر لیا جبکہ اہلِ نظر یہ دیکھ دیکھ کر روتے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا گُم کر دیا اور کیا کیا حاصل نہ کر کے مستوجب سزا بن گئے۔''

(معرکۂ دجّالِ اکبر جلد اول از اسرار عالم، دار العلم، نئی دہلی)

ہمارے مذہبی لیڈروں کا محض اِس بات پر قانع ہو جانا بلکہ اسے اپنا ایک کارنامہ قرار دے کر خوشی سے پھولے نہ سمانا کہ ''دینی جماعتوں نے ملک کو سیکولر بننے سے روک رکھا ہے''، ایسے ہی ہے جیسے کوئی ہٹا کٹا نوجوان ایک من کا تھیلا اٹھا کر فخر کا اظہار کرے حالانکہ وہ اپنی جسمانی صحت و تندرستی (Capability) کے لحاظ سے دو من کا تھیلا اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

پس بڑی بڑی مذہبی جماعتوں اور قد آور شخصیات و رہنماؤں کے باوجود پاکستان میں اِسلامی نظام کا نافذ نہ ہو سکنا، اس قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی اور ناکامی ہے۔ اور اس کے ذمہ دار یقیناً ہمارے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی رہنما بھی ہیں جو سیاست برائے سیاست میں مصروف ہیں اور جن کی اولین ترجیح نفاذِ اسلام نہیں بلکہ ذاتی و طبقاتی مفادات ہیں۔

حدود و ترمیمی بل پاس ہونے کی صورت میں استعفے دے دینے کے اعلان کے باوجود ہماری مذہبی جماعتوں کا اس وعدہ سے پھر جانا، اس حقیقت کا مظہر ہے کہ ہمارے حکمران طبقہ کی طرح مذہبی حلقوں کے نزدیک بھی عہد کی پاسداری کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ان ناکامیوں اور نااہلیوں کی سزا ہمیں دنیا میں تو خسف، مسخ اور سنگباری وغیرہ کے عذاب ہائے الٰہی کی صورت میں مل کر رہے گی جبکہ آخرت کا مواخذہ اس کے علاوہ ہوگا۔ سورہ التکاثر کی آخری آیت اسی حقیقت کا اظہار کرتی ہے:

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (٨)

'' پھر تم سے ضرور باز پُرس کی جائے گی اُن نعمتوں کے متعلق جو تمہیں دی گئی تھیں۔''

ان نعمتوں سے مراد وہ تمام وسائل، صلاحیتیں اور اختیارات ہیں جو کسی انسان کے زیر تصرف ہو سکتے ہیں۔

ہمارے سیاسی حلقوں بالخصوص مذہبی جماعتوں نے اگر ان نعمتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے نفاذ اسلام کی جدوجہد نہ کی تو یقیناً انہیں اس کے لئے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس کی جواب دہی کرنا ہوگی۔

(۲) معاشی فتنہ

اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستانی قوم بھی اُسی طرح معاشی فتنہ میں مبتلا ہے جس طرح سے اہلِ عرب، بالخصوص پاکستان کے 'مترفین' یعنی خوشحال طبقہ کے متعلق تو یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ بھی قارونیت کے معاشی فتنہ میں مبتلا ہے جب کہ پاکستان کے حکمران تو اس وقت عملاً قارون کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تقسیمِ برصغیر کے دنوں کی لوٹ مار اور قیام پاکستان کے فوراً بعد جائیدادوں، مکانوں اور پلاٹوں کی جائز و ناجائز الاٹمنٹ کے دھندے نے پاکستانی قوم کو ''ہوسِ زر'' میں ایسا مبتلا کر دیا کہ یوں گمان ہونے لگا جیسے ہم نے آزادی صرف معاشی مفادات کے حصول کے لئے حاصل کی تھی نہ کہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے لئے؟

اس ہوسِ زر کا نتیجہ ہی ہے کہ آج کرپشن ہمارے معاشرے میں سرطان کی طرح اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہے اور مالِ امانت کو مالِ غنیمت سمجھ کر ہڑپ کر لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی جبکہ رشوت کو ہماری قوم نے عملاً حلال قرار دے رکھا ہے۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہم نے مشرقی پاکستان کو اپنے لئے ''ایک معاشی بوجھ'' خیال کرتے ہوئے اس سے جان چھڑا لینے میں ہی بہتری خیال کی؟

کیا ہم نے دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کی میزبانی جوش وخروش کے ساتھ اس غرض سے نہیں کی تھی کہ اسلامی ترقیاتی بنک کا قیام پاکستان میں ممکن بنایا جاسکے تاکہ ہم اس کے سرمایہ سے زیادہ سے زیادہ فوائد سمیٹ سکیں؟

کیا ہم نے جہادِ افغانستان میں حصہ بھی اس لئے بڑھ چڑھ کر نہیں لیا تھا تاکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے علاوہ غیر ملکی امداد کے مزے بھی لُوٹ سکیں؟

وسطی ایشیائی ریاستوں سے معاشی مفادات کے حصول کے لئے ہی ہم نے افغانستان میں طالبان کو برسرِ اقتدار آنے میں مدد فراہم کی تھی تاکہ نئے تجارتی رُوٹس کا قیام عمل میں لایا جاسکے اور معاشی مفادات کے تحفظ وامریکی امداد کے لالچ میں ہی ہم نے طالبان کی پشت پناہی سے ہاتھ کھینچ بھی لیا تھا۔ معاشی مفادات وانعامات کے لالچ میں ہی ہم اپنے راسخ العقیدہ مسلمان بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں اور یا پھر امریکہ کے حوالے کر رہے ہیں۔

ہم نے اپنے ملک میں زکوٰۃ کا ایسا نظام نافذ کیا جو بذاتِ خود اسلامی نظامِ زکوٰۃ کی توہین اور بدنامی کا باعث ہے۔

ہماری سپریم کورٹ نے سود کو حرام قرار دیا تو ہم نے اسے قبول کرنے کی بجائے اس کے خلاف اپیلیں دائر کر کے اللہ تعالیٰ کے خلاف اپنے اعلانِ جنگ کو بدستور جاری رکھا۔

معاشی فتنہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہی ہمارے ملک کی سیاست میں ہارس ٹریڈنگ، فلور کراسنگ اور لوٹا ازم ایسی قبیح امراض نے جنم لیا اور یہ امراض اب ضلعی حکومتوں کے نظام کے تحت عوامی سطح پر پھیل چکی ہیں۔ ہمارے حکمران ہر روز ہمیں معاشی ترقی کے سپنے دکھا رہے ہیں حالانکہ ہمارا بال بال حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی بدعنوانیوں وعیاشیوں کی وجہ سے قرضوں میں جکڑا ہوا ہے اور ان دونوں طبقات نے بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے بے حد وحساب دولت بیرونی ممالک کے بینکوں میں جمع کروا رکھی ہے۔

جس طرح قارون کی خوشحالی ومادی ترقی کو دیکھ کر اس کے ہم قوم بھی اُس جیسا ہی بننے کی خواہش کر رہے تھے، اسی طرح ہم بھی اپنی معاشی ترقی کے خوابوں کی تکمیل کے لئے ''دوبئی'' کی طرز پر ''گوادر فری پورٹ'' بھی تیز رفتاری سے تعمیر کروا رہے ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ اب ہم نے اپنا وزیرِ اعظم بھی ایک درآمد شدہ ماہرِ معاشیات کو منتخب کر لیا ہے اور یہ ہمارے معاشی فتنہ میں مبتلا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔

گویا قارونیت کا معاشی فتنہ عرب ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی اپنی جڑیں پوری طرح مضبوط کر چکا ہے اور اس معاشی فتنہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بھی پاکستانی قوم کو ''خسف بالمشرق'' کے عذابِ الٰہی کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۳) بدترین حکمرانوں کا تسلط، فسق وفجور اور عہد شکنی

خسف بالمشرق کے مسئلہ کو حضرت ابوہریرہؓ کی قبل ازیں بیان کردہ روایت کی روشنی میں سمجھنے سے بھی مدد ملتی ہے۔ اس روایت میں سرخ آندھی، خسف اور مسخ وغیرہ کے جن عذاب ہائے الٰہی کی وعید سنائی گئی ہے، غالب امکان یہی ہے کہ وہ اُن ممالک یا اقوام پر ہی نازل ہوں گے جنہوں نے طالبان کی اسلامی حکومت کے خاتمے میں بلاواسطہ یا بالواسطہ کردار ادا کیا تھا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اس روایت ہی کے الفاظ ہیں: ''جب قوم کا رہنما ذلیل ترین آدمی ہوگا اور بدکار قبیلے کا سردار بن جائے گا۔''

طالبان حکومت کے خاتمے میں بلاواسطہ یا بالواسطہ کردار ادا کرنے والے حکمرانوں کو بلاشبہ بدترین اور ذلیل ترین انسان کہا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اور بغیر قانونی تقاضے پورے کئے، افغانستان پر جنگ مسلط کی یا اس میں مدد فراہم کی تھی۔

میری اس رائے کی تائید محض اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک یعنی پاکستان کو دولخت کرنے والے کرداروں کے 'انجام بد' سے بھی ہو جاتی ہے۔

ہمارے ماضیٔ قریب کی اس زندہ مثال سے تو اب بہت سے لوگ واقف ہو چکے ہیں کہ 'شیخ مجیب الرحمٰن'، 'ذوالفقار علی بھٹو'، 'اندرا گاندھی' اور ان تینوں کے خاندانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ان کے پاکستان کو دولخت کرنے میں اہم ترین کردار کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

طالبان کی اسلامی حکومت کے خاتمے کے کرداروں کے متعلق تو یقیناً بہت بڑی سزا کی امید رکھنی چاہئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کو دولخت کرنے والے سیاہ کارنامے میں سیاسی شخصیت کا عمل دخل زیادہ تھا جبکہ طالبان حکومت کے خاتمے میں حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ان کے عوام کی مجرمانہ غفلت وخاموشی اور ان کا حد سے زیادہ فسق وفجور میں مبتلا ہونا بھی ہے جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الزخرف کی آیت نمبر ۵۴ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جب کہ درج ذیل آیات میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ/ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ/ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ

قَبْلُ ؕ/ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ/ (۱۰۱) وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ/ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ/

۱۱ یہ (ہلاک ہوجانے والی) وہ بستیاں ہیں کہ جن کی خبریں ہم آپ ﷺ کو سنا رہے ہیں، بالتحقیق اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لیکر آئے، پس وہ ایمان والے نہ بنے، اس وجہ سے کہ وہ پہلے ہی جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ انکار کرنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے، اور ہم نے اُن میں سے اکثر میں پاسِ عہد نہ پایا اور ہم نے اُن میں سے اکثر کو فاسق ہی پایا۔۱۱ (سورۃ الاعراف ۱۰۲۔ ۱۰۱)

ان آیات میں فسق و فجور کے علاوہ عہد شکنی کو بھی عذاب الٰہی کے نزول کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ عہد شکنی بھی اس وقت افراد کے ذاتی معاملات سے لیکر اقوام کے اجتماعی معاملات تک بڑے وسیع پیمانہ پر پھیل چکی ہے۔

اہل عرب نے اسلام سے متعلق اپنے دینی عہد کی خلاف ورزی کی ہے ،اہل پاکستان نے اسلام نافذ کرنے کے اپنے عہد سے انحراف کیا ہے تو بھارت نے اقوام متحدہ کے فورم پر اہل کشمیر کو حق خودارادیت دینے کے وعدہ سے انحراف کیا ہے جبکہ امریکہ کی عالمی عہد شکنیاں تو شمار کرنا ہی مشکل ہے۔

طالبان کا سب سے بڑا مجرم تو امریکہ ہی ہے جس کے متعلق خود حضرت ملا عمر مجاہد نے پیش گوئی کر دی تھی اور راقم نے اس تباہی کا مصداق خسف بالمغرب کا عذاب قرار دیا ہے۔

اس کے بعد باری آتی ہے پاکستان، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں کی جنہوں نے افغانستان پر حملے کیلئے اپنی سرزمین، فضا اور سمندر فراہم کئے حالانکہ پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے نہ صرف طالبان حکومت کے قیام میں اہم کردار ادا کیا تھا بلکہ اسے تسلیم بھی کر رکھا تھا اور اس وجہ سے ان پر اس اسلامی ریاست کی حفاظت کی اضافی ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کے متعلق بھی راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ وہ خسف بجزیرۃ العرب کے عذاب کا یقینی ہدف معلوم ہوتے ہیں۔

اب صرف پاکستان کا معاملہ باقی رہ جاتا ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں نے قوم کو یہ بات باور کرائی تھی کہ اپنے ازلی دشمن بھارت سے بچاؤ کے لئے ہم نے امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے حالانکہ یہ پاکستانی حکمرانوں کا محض ایک بہانہ تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی تجویز کے مطابق ہوش مندی، تدبر اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان اور ایران کے ساتھ اتحاد قائم کر لیتے تو امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس طرح شمالی کوریا سے لے کر شام تک ایک طویل ترین زمینی و فضائی زون اس کے خلاف وجود میں آجاتا۔

تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس تجویز کی کامیابی کے امکانات بھی زیادہ روشن نہ تھے جس کی بنیادی وجہ ایران کی طالبان کے ساتھ مخاصمت، بھارت کے ساتھ دوستی اور ان دونوں ممالک کی طرف سے طالبان کے خلاف برسرِ پیکار شمالی اتحاد کی پشت پناہی کی تھی۔

طالبان کے خلاف یوٹرن لینے کی ایک بڑی وجہ ایران بھی تھا لہٰذا میرے خیال میں ایران اور بھارت طالبان کے بالواسطہ مجرم ہیں۔ (بلواسطہ اس لئے کہ ان دونوں ممالک نے براہِ راست اپنی سرزمین، فضا اور سمندر طالبان کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تو امریکہ کو فراہم نہیں کئے تھے مگر طالبان حکومت کو ناکام بنانے کیلئے انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ چھوڑا تھا)۔ ایران کو تو اپنے کئے کی کچھ سزا تباہ کن زلزلوں کی صورت میں مل چکی ہے اور باقی سزا کے آثار متوقع امریکی حملے یا پھر کم از کم ایٹمی صلاحیت سے محرومی کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

جبکہ بھارت پر اب تک عذاب الٰہی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔

لہٰذا راقم کا خیال ہے کہ خسفِ بالمشرق کے عذاب کا نشانہ بیک وقت پاکستان اور ہندوستان دونوں ہوں گے۔

ہندوستان پر عذاب الٰہی نازل ہونے کی کئی وجوہات موجود ہیں۔

۱۱ ستمبر کے واقعہ کے فوراً بعد ہندوستان نے افغانستان پر حملہ آور ہونے کے لئے امریکہ کو اپنے اڈے دینے کی پیش کش کر دی تھی۔ طالبان کے خلاف ہندوستان کے بغض و عناد کی بنیادی وجہ اسلام دشمنی اور افغانستان کا تاریخی پس منظر تھا۔ چونکہ ماضی میں ہندوستان پر قبضہ کرنے والے اکثر و بیشتر فاتحین یا تو افغانی تھے یا پھر براستہ افغانستان ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اب طالبان نے اپنے ملک میں اسلامی حکومت قائم کر دی تھی جس کے اثرات پہلے پاکستان اور پھر پورے برصغیر پر پڑنے کا خطرہ تاریخی تناظر میں ایک اہم ترین حقیقت تھا۔

اسی لئے ہندوستان طالبان کے خلاف برسرِ پیکار شمالی اتحاد کو ہر ممکن مدد فراہم کرتا رہا تھا تاکہ یہ ملک مستقل طور پر خانہ جنگی میں الجھا رہے۔ اور یا پھر کم از کم وہاں ایک پاکستان مخالف اور بھارت نواز حکومت قائم ہو سکے۔

مزید برآں کشمیر پر غاصبانہ قبضہ، کشمیریوں کو حقِ خودارادیت دینے کے عہد سے انحراف، اہلِ کشمیر پر بالخصوص اور بھارتی مسلمانوں پر بالعموم ظلم و ستم، اپنی فلم انڈسٹری کے ذریعے فحاشی و عریانی کو فروغ دے کر مسلمانوں پر تہذیبی و ثقافتی جنگ مسلط کرنا وغیرہ بھی ایسے جرائم ہیں جو بھارت کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنا دیتے ہیں۔

میرے ان خیالات کو برصغیر کے ایک صوفی بزرگ حضرت نعمت اللہ شاہ ولیؒ کی اس پیش گوئی سے بھی تقویت ملتی ہے کہ

''ایک زلزلہ قیامت کے زلزلوں کی طرح آئے گا اور وہ زلزلہ قہر بن کر ہندوسندھ میں نمودار ہوگا۔''

(بحوالہ، اکیسویں صدی، کیا ہونے والا ہے؟ پیشگوئیاں از علیم اقبال، ثنا پبلی کیشنز، لاہور)

یہاں یہ حقیقت واضح رہے کہ حضرت نعمت اللہ شاہ ولیؒ کی بہت سی پیشگوئیاں سچ ثابت ہو چکی ہیں جن میں سے ایک قیام پاکستان بھی ہے۔

۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء کو ہندوسندھ کے مرکزی علاقہ ''بھارتی گجرات'' میں آنے والے تباہ کن زلزلہ کو اسی عظیم زلزلے کی ابتدائی نشانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ماہرینِ ارضیات بھی اس علاقہ میں مزید زلزلوں کے امکانات ظاہر کر چکے ہیں۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں غالباً اسی عظیم زلزلے اور اس کے نتیجے میں خسف بالمشرق کے واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کا تذکرہ ہے:

ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ○ اَمْ اَمِنْتُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ

حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ O

''کیا تم اس بات سے بے خوف ہو چکے ہو کہ وہ جو (تمہارا رب) آسمان میں ہے، تمہیں زمین میں دھنسا دے چنانچہ وہ اچانک لرزنے لگے۔ یا تم بے خوف ہو اس بات سے کہ وہ جو (تمہارا رب) آسمان میں ہے تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے۔ پس تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ یہ تنبیہ کیسی تھی۔'' (سورۃ الملک ۱۷۔۱۶)

''ایک تیر سے دو شکار'' کے مصداق ''حسف بالمشرق'' کے نتائج بھی دونوں ممالک میں مختلف ظاہر ہوں گے۔ پاکستان میں روشن خیال اسلام اور معاشی ترقی کا راگ الاپنے والے مغرب زدہ کٹھ پتلی حکمرانوں کے معاشی ترقی کے دعوے اور ملک کو روشن خیال بنانے کے ارادے خاک میں مل جائیں گے اور ردِعمل میں ان کے خلاف انشاء اللہ ایک زوردار اسلامی تحریک برپا ہو جائے گی۔ اس تحریک کے نتیجہ میں راسخ العقیدہ مسلمان بالآخر ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی خبر ''یخرج الناس من المشرق'' کے الفاظ سے رسول اللہؐ نے دی ہے۔ اس انقلاب سے پیشتر یا فوراً بعد افغانستان میں طالبان بھی برسر اقتدار آ جائیں گے اور پاکستان و افغانستان انشاء اللہ ایک متحدہ وفاق کی صورت اختیار کر لیں گے۔

دوسری طرف بھارت تباہ کن زلزلے اور واقعہ حسف کے نتیجہ میں ہونے والی تباہی کی وجہ سے معاشی بحران کا شکار ہونے اور ''پاک افغان اتحاد'' کے معرضِ وجود میں آ جانے کی وجہ سے اس اسلامی انقلاب کے ممکنہ مضمرات کے باوجود اس کے خلاف کوئی عملی ردِعمل دکھانے کی پوزیشن میں نہیں رہے گا۔

درحقیقت پاکستان کا امریکی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنا اور افغانستان میں امریکہ کا اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہو جانا ہی بھارت کے لئے بہت بڑے صدمے کا باعث ہوگا اور اسی حقیقت کا اظہار ۲۰۰۱ء کی افغان امریکہ جنگ کے دوران بھارت کی وزیرِ اطلاعات ''شمسہ سوراج'' نے ان الفاظ میں کیا تھا:

''افغانستان میں امریکہ کی ناکامی بھارت کی سیاسی موت کے مترادف ہوگی۔''

لہٰذا تبدیل شدہ حالات کے نتیجہ میں ہندوؤں کی روایتی موقع پرستی، ابن الوقتی اور 'تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو' کی پالیسیوں کی وجہ سے اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ اس کے ساتھ ''صلح حدیبیہ'' کی طرز کا کوئی معاہدہ طے پا جائے۔ غالباً اسی معاہدہ کی وجہ سے ہی پاک افغان مشترکہ فورسز کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ جزیرۃ العرب اور مشرق وسطیٰ کی طرف پیش قدمی کر کے پہلے ظہور مہدیؑ اور بعد ازاں بیت المقدس کی آزادی کو ممکن بنا سکیں جس کی خبریں مختلف روایات میں نبی کریمؐ نے اُمت کو دے رکھی ہیں۔

سرزمینِ مشرق کا خروج اور خسف بالمشرق

خسف بالمشرق کے معاملہ کو ابنِ ماجہ میں حضرت عبداللہ بن حارثؓ کی روایت کردہ اُس مشہور روایت سے بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس کا چرچا ڈاکٹر اسرار احمد اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

يخرج الناس من المشرق فيطئون للمهدى يعنى سلطانه - (عن عبدالله بن الحارث رواه ابن ماجه)

''مشرق کی کسی سرزمین سے لوگ خروج کریں گے۔ پس وہ مہدیؑ کی حکومت کے لئے زمین ہموار کر دیں گے۔''

راقم محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے اس خیال سے بالکل متفق ہے کہ یہاں ''مشرق کی سرزمین'' سے مراد ارضِ پاکستان ہے کیونکہ یہی وہ ملک ہے جہاں مستقبل میں اسلامی انقلاب کے امکانات سب سے زیادہ موجود ہیں۔

تاہم راقم اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ مشرق کی سرزمین سے خروج کرنے والوں اور خسف بالمشرق کے عذاب کا نشانہ بننے والوں کا تعلق ایک ہی خطۂ ارضی سے ہوگا۔

دلیل اس امر کی یہ ہے کہ جب خسف کے عذاب کا نشانہ بننے والی سرزمینِ عرب میں ایک نجات دہندہ کے طور پر حضرت مہدیؑ کا ظہور ایک امرِ قطعی ہے تو خسف بالمشرق کے عذاب کا نشانہ بننے والے علاقہ سے ہی ظہورِ حضرت مہدیؑ کی تمہید کے طور پر لوگوں کے خروج یعنی اسلامی انقلاب برپا کر دینے کا امکان بھی بدرجۂ اتم موجود ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے حکمران طبقہ کی کمزوریوں و حماقتوں اور ہماری قوم کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ہماری قوم بھی فرعون حاضر کی بلواسطہ غلامی میں چلی گئی تھی جس کا ثبوت ایک سابق فوجی حکمران جنرل محمد ایوب اور موجودہ فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف کی کتابوں میں کئے جانے والے انکشافات و اعترافات سے بخوبی مل جاتا ہے۔

غلامی کا یہ شکنجہ بلاشبہ دن بدن کستا ہی چلا جا رہا ہے جس کا احساس یقیناً پوری قوم کو ہے اور جسے توڑنے کے لئے یہ قوم کسی بھی وقت آمادہ و مستعد ہو سکتی ہے۔

یقیناً پاکستانی قوم میں اسکی مکمل اہلیت و صلاحیت موجود ہے اور یہاں کی فضاء بھی دن بدن ایک عوامی اسلامی انقلاب کے لئے سازگار ہوتی چلی جا رہی ہے۔

مشرق کی سرزمین سے مراد اگر فی الواقع ارضِ پاکستان ہی ہو تو یہاں لوگوں کے خروج کا واضح مطلب یہی ہوگا کہ وہ اپنے دیس میں دین اللہ کو قائم و نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

اگر انہوں نے بنی اسرائیل کی طرح خروج کا عملی قدم اُٹھا لیا اور فرعون حاضر نے اسے ناکام بنانے کی کوشش کی تو فرعون مصر کے واقعہ غرق کی طرح اُن کی نصرت راقم کے خیال میں خسف بالمغرب کے واقعہ کی صورت میں کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز

لیکن ہمیں یہ حقیقت خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ پہلا قدم ہمیں خود ہی اُٹھانا ہوگا۔ مطلب یہ کہ دین اللہ کی نصرت کی خاطر خروج کی صورت میں پہلا عملی قدم ہمیں خود ہی کر اُٹھانا ہوگا جیسا کہ درج ذیل آیت میں اللہ رب العزت نے اہل ایمان سے اسکا مشروط وعدہ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ/ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۷)

۱۱ اے ایمان والو! اگر تم (دین اللہ کو قائم کرنے میں) اللہ کی مدد کرو گے تو وہ (بھی) تمھاری مدد کرے گا اور (دین اللہ کے لئے اُٹھے ہوئے تمھارے) قدموں کو مضبوطی سے جمادے گا۔۱۱ (سورۃ محمد ۷)

۱۱ یخرج الناس من المشرق ۱۱ کے الفاظ میں سے الناس کا لفظ بھی غور طلب ہے۔ اس کا ایک عام مطلب تو عوام اور لوگ لیا جاسکتا ہے تاہم اہل نظر کے لئے ایک اور معنی بھی قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ الناس کا لفظ قرآن حکیم (سورۃ البقرۃ آیت ۱۳) میں جماعت صحابہ کرامؓ کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

راقم کے خیال میں یہاں وہ جماعت مراد ہے جس کا ذکر متعدد احادیث میں ملتا ہے، جو آخری زمانہ میں ہوگی اور اُسی قوت ایمانی کا مظاہرہ کرے گی جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے کیا تھا۔ یہ جماعت دین اللہ کی اُسی طرح سے نصرت کرے گی جیسا کہ جماعت صحابہ کرامؓ نے کی اور ویسا ہی اجر پائے گی جیسا حضرت صحابہ کرامؓ کو ملا تھا۔

مستقبل کی اس جماعت اور جماعت صحابہؓ کے لئے الناس کا لفظ غالباً اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ دین اللہ کی مغلوبیت کے دور میں یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی یا کامل انسان کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور یقیناً انہیں جوہر انسانیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ باسعادت لوگ ہیں جو رب کی دھرتی پر رب کا نظام اُس کی کامل شکل میں قائم و نافذ کرنے کا کارنامہ سرانجام دینے کی وجہ سے ابن آدم کو دی گئی خلافت ارضی کا صحیح معنوں میں حق ادا کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(باب ششم)

واقعہ اصحابِ قریہ کی اُمت مسلمہ کی موجودہ حالت زار کے ساتھ تطبیق

اُم القریٰ کا مفہوم اور واقعہ اصحاب قریہ

اگر یوں کہا جائے کہ جزیرۃ العرب میں واقع ''سعودی عرب'' اور برصغیر میں واقع ''پاکستان'' عالمِ اسلام کے دو مضبوط ترین قلعے ہیں، تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔

سعودی عرب اگر عالمِ اسلام کا روحانی مرکز وقبلہ ہے تو پاکستان کو عالمِ اسلام کا سیاسی مرکز وقبلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سعودی عرب میں جزوی طور پر اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ ہے تو پاکستان کے آئین میں قرار دادِ مقاصد کے ذریعے اقتدار اعلیٰ کا مالک ذات باری تعالیٰ کو تسلیم کیا گیا ہے جس کی مثال دوسرے اسلامی ممالک کے دساتیر میں موجود نہیں ہے۔

سعودی عرب اور پاکستان کو عالمِ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا ادراک ہم سے زیادہ ہمارے دشمن رکھتے ہیں۔ روسی صدر ولادی میر پوٹن کا بارہا امریکہ کو سعودی عرب اور پاکستان پر توجہ مرکوز کرنے اور ان کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے مشورے دینا، اسی حقیقت سے آگاہی کی بناء پر ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے ساتھ تصادم کا مطلب روسیوں کے خیال میں امریکہ اور عالمِ اسلام کا کھلا تصادم ہوگا اور ان دونوں فریقوں کو کمزور کرنے کا سبب بنے گا جبکہ روس کو ایک بار پھر عالمی سپر پاور بننے کا موقع فراہم کرے گا۔

سرد جنگ کے دوران امریکہ اور عالمِ اسلام (بالخصوص پاکستان اور سعودی عرب) ایک دوسرے کے اہم ترین اتحادی تھے اور یہی اتحاد افغانستان میں روسی شکست اور بالآخر اس کے زوال کا سبب بنا تھا لہٰذا روس ان دونوں فریقوں کا زخم خوردہ ہے اور ان کو آپس میں برسرِ پیکار کروا کر اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب کی عالمِ اسلام میں اہمیت کی پیش نظر انہیں قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ''اُمّ القریٰ'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ قران کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم میں نبی یا رسول اس کے اُمّ القریٰ میں ہی مبعوث کیا جاتا ہے۔

اُمّ القریٰ

کا لغوی مفہوم ہے ''بستیوں کی ماں''۔ بالعموم اس کا ترجمہ بستیوں کا مرکز یا بستیوں کا مرکزی شہر وغیرہ کیا جاتا ہے۔ قرانِ حکیم میں مکۃ المکرّمۃ کو اُمّ القریٰ قرار دیا گیا ہے حالانکہ اُس دور میں روم اور فارس جیسی عظیم سلطنتیں موجود تھیں اور ان کے کسی بڑے شہر کو بھی اُمّ القریٰ قرار دیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ان دو عظیم سلطنتوں کے کسی شہر کی بجائے مکۃ المکرّمۃ کی وادی میں ہوئی۔ لہٰذا اُمّ القریٰ سے مراد ایسا شہر، خطہ یا علاقہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے جو ایسی تبدیلیوں وانقلابات کو جنم دے سکے جو دوسرے علاقوں وخطوں پر اثر انداز ہو کر وہاں بھی تبدیلیوں وانقلابات کو جنم دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ راقم کے خیال میں یہ اُمّ القریٰ کی زیادہ بہتر تعریف ہے کیونکہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ مکۃ المکرّمۃ کا اسلامی انقلاب کس قدر عالمگیر تبدیلیوں واثرات کا حامل ثابت ہوا تھا اور اس عظیم ترین اسلامی انقلاب نے کیونکر اپنے دور کی دو سپر پاورز یعنی روم وفارس کو شکستِ فاش سے دوچار کر دیا تھا۔

اس تعریف کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سرزمینِ افغانستان کو بھی عالمِ اسلام کے تیسرے اُمّ القریٰ کی حیثیت حاصل ہے جس کی کئی وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں۔

(۱) افغانستان غالباً وہ واحد سنی مملکت ہے جو نوآبادیاتی دور میں بھی مغربی سامراج کی براہِ راست غلامی میں نہیں آسکا تھا لہٰذا جذبۂ حریت وآزادی جس قدر افغان قوم میں پایا جاتا ہے، عالمِ اسلام میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام کا ظہور بھی ایک ایسے عرب معاشرہ میں ہوا تھا جو بیرونی اثرات سے بہت حد تک پاک تھا۔ اگرچہ سرزمینِ عرب کے پڑوس میں روم اور فارس جیسی عالمی قوتیں موجود تھیں لیکن اس کے باوجود عرب قوم اپنی آزادی اور جداگانہ تشخص برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ہندوستان پر انگریز کی حکمرانی کے دور میں بھی افغانستان انگریز وروسی سامراجی مملکتوں کے بیچ واقع ہونے کے باوجود معجزانہ طور پر اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

(۲) افغانستان میں اکثریت پختون قوم کی ہے جس کے رسوم ورواج اور عادات واطوار اُس عرب معاشرے سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں جس میں اسلام کا ظہور ہوا تھا۔

(۳) سرزمینِ افغانستان میں سرخ روسی سامراج کے خلاف فیصلہ کن لڑائی لڑی گئی اور بظاہر ناقابلِ شکست سمجھے جانے والے سوویت یونین کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ اس جہاد کے نتیجہ میں وسطی ایشیائی مسلم ریاستوں کو آزادی کی نعمت بھی حاصل ہوئی۔

(۴) اسی سرزمینِ افغانستان میں طالبان تحریک ابھری جس نے طوائف الملوکی کے شکار اپنے ملک کو نہ صرف امن کا گہوارہ بنا دیا بلکہ ایک مثالی اسلامی ریاست قائم کرنے کی بھی بھرپور کوششیں کیں۔ اس تحریک کے ممکنہ اثرات کی وجہ سے ہی اس کے خلاف کاروائی کی گئی تھی۔

(۵) افغان قوم کی تاریخ بھی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ دوسری اقوام پر فیصلہ کن اثرات مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سلطان محمود غزنوی، شیر شاہ سوری اور احمد شاہ ابدالی (بانی افغانستان) کی کامیابیاں اس کی گواہی دیتی ہیں۔

حضور نبی اکرمؐ پر چونکہ نبوت ورسالت کا خاتمہ ہو چکا ہے لہٰذا انبیاء ورُسل کے اس خلا کو مجددین ومصلحین کی جماعتیں پورا کرتی رہی ہیں۔ اس تناظر میں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اصلاحِ اُمت اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عظیم کاموں کے مرکز بھی عالمِ اسلام کے یہی تین اُمّ القریٰ یعنی سعودی عرب، پاکستان اور افغانستان ہی ہونگے اور مصلحین اُمت بھی انہی علاقوں میں پیدا ہونگے۔

تاہم یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ذرائع مواصلات اور رسل ورسائل کی حیرت انگیز ترقی کے نتیجہ میں پوری دنیا ایک ہی بڑی بستی یا جدید اصطلاح میں ایک عالمی گاؤں (Global

(village) کی صورت اختیار کر چکی ہے۔اگر پوری دنیا کو ایک ہی بڑا گاؤں قرار دیا جاسکتا ہے تو عالمِ اسلام بہرحال اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اسے بھی ایک بڑی بستی یا قرآنِ حکیم کی سورۃ یٰسین کی روشنی میں ''القریۃ'' سے موسوم کیا جائے۔

لہٰذا سعودی عرب، پاکستان اور افغانستان اس ''عظیم القریۃ'' کے دو ایسے اہم ترین محلے، علاقے یا شہر (اُمّ القرٰی) قرار دیئے جاسکتے ہیں جہاں سے مستقبل میں غلبۂ اسلام کے لئے بنیادی اور حتمی قوت فراہم ہوگی۔

حضور اکرمؐ کے اس فرمان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ '' فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخبرُ مَا بَعْدَ كُمْ''یعنی ''اس (قرآن) میں تم سے پہلوں کی خبریں بھی موجود ہیں اور تم میں سے بعد والوں کی بھی'' (جامع ترمذی وسنن درامی عن حضرت علیؓ) ، قرآن کریم کے ''قلب''یعنی سورۃ یٰسین کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں بیان کیا گیا ''اصحاب قریہ'' کا واقعہ مکمل طور پر اُمت مسلمہ کی موجودہ صورتحال پر منطبق ہوتا ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس واقعہ کا قرآن کریم کے بیان کے مطابق مطالعہ کرلیا جائے۔

واقعہ اصحابِ قریہ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ/ اِذۡ جَآءَ هَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ/ (۱۳) اِذۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ اثۡنَيۡنِ/ فَكَذَّبُوۡهُمَا/ فَعَزَّزۡنَا
بِثَالِثٍ/ فَقَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلَيۡكُمۡ مُّرۡسَلُوۡنَ/ (۱۴) قَالُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۙ/ وَمَاۤ اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ مِنۡ شَىۡءٍ ۙ/ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَكۡذِبُوۡنَ
(۱۵) قَالُوۡا رَبُّنَا يَعۡلَمُ اِنَّاۤ اِلَيۡكُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ (۱۶) وَمَا عَلَيۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ (۱۷) قَالُوۡۤا اِنَّا تَطَيَّرۡنَا بِكُمۡ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهُوۡا/
لَنَرۡجُمَنَّكُمۡ/ وَلَيَمَسَّنَّكُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ (۱۸) قَالُوۡا طَآئِرُكُمۡ مَّعَكُمۡ ؕ اَئِنۡ ذُكِّرۡتُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ (۱۹) وَجَآءَ مِنۡ
اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ رَجُلٌ يَّسۡعٰى ۬/ قَالَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِيۡنَ (۲۰) اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا يَسۡئَلُكُمۡ اَجۡرًا وَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ (۲۱) وَمَا لِىَ لَاۤ
اَعۡبُدُ الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ/ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (۲۲) ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً/ اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ/ لَّا تُغۡنِ عَنِّىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡئًا وَّلَا
يُنۡقِذُوۡنِ/ (۲۳) اِنِّىۡۤ اِذًا لَّفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (۲۴) اِنِّىۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّكُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ/ (۲۵) قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ ؕ/ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ
يَعۡلَمُوۡنَ/ (۲۶) بِمَا غَفَرَ لِىۡ رَبِّىۡ/ وَجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ (۲۷) وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ/ وَمَا
كُنَّا مُنۡزِلِيۡنَ (۲۸) اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً/ فَاِذَا هُمۡ خَامِدُوۡنَ (۲۹) يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚؕ/ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ/ اِلَّا
كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ/ (۳۰) اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ/ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ (۳۱) وَاِنۡ كُلٌّ/ لَّمَّا جَمِيۡعٌ
لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ (۳۲)

''اے پیغمبرﷺ ان کو ایک بستی والوں کا واقعہ بطور مثال سنائیے جب ان کے پاس (اللہ کے) رسول آئے۔جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا۔تب ہم نے ان کو ایک تیسرے رسول کے ذریعے قوت وعزت عطا فرمائی۔پس اُن تینوں نے (ان بستی والوں سے) کہا! اس میں کوئی شک والی بات نہیں ہے کہ ہم تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔(جواباً) انہوں نے کہا کہ تم بھی تو ہماری طرح کے ایک عام انسان ہو اور اللہ تعالیٰ جو رحمٰن ہے، نے کوئی چیز (یعنی ہدایت تم پر) نازل نہیں فرمائی، اس لئے تم محض جھوٹے (انسان) ہو۔انہوں نے کہا! ہمارا رب خوب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر (اللہ تعالیٰ کا پیغام) پہنچا دینا ہی ہے۔ان بستی والوں نے کہا کہ ہمیں تو تمہاری نحوست کی وجہ سے تکالیف پہنچی ہیں۔اور اگر تم اس (دعوت وتبلیغ) سے باز نہ آؤ گے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کردیں گے اور تمہیں ہماری طرف سے دردناک سزا دی جائے گی۔رسولوںؑ نے کہا! تمہاری نحوست تو خود تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔(کیا تم یہ باتیں اور حرکتیں اس لئے کر رہے ہو) کہ ہم تمہیں نصیحت کر رہے ہیں؟ بلکہ تم تو حد سے گزر جانے والے لوگ (معلوم ہوتے) ہو۔اور (اس نازک وگھمبیر صورتِ حال میں) شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا!''اے میری قوم کے لوگو! تم ان رسولوں کی پیروی کرو (اور) تم پیروی کرو ایسے (مخلص) رسولوں کی جو تم سے اپنے اس کارِ خیر کا اجر طلب نہیں کر رہے ہیں اور وہ ہیں بھی بالکل سیدھی راہ پر۔اور یہ کہ مجھے کیا بات مانع ہوسکتی ہے کہ میں صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کی بندگی اختیار نہ کروں اور (جبکہ) تم سب کو (بھی) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔کیا میں اس ذاتِ واحد کے سوا کسی اور کو معبود بنالوں؟ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو مجھے (تمہارے) ان معبودانِ باطل کی سفارش کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی اور نہ ہی وہ (مجھے عذاب سے) بچا سکیں گے۔اگر میں

ایسا کروں گا تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو اپنے پروردگار پر ہی مکمل ایمان رکھتا ہوں پس تم (میری) اس بات کو خوب کان لگا کر سن لو (اور مان لو)۔ (اسے قتل کر دیا گیا تو ہماری جانب سے) کہا گیا کہ جنت میں (بے خطر) داخل ہو جاؤ۔ (جنت میں پہنچ کر) اس نے کہا!'' کاش میری قوم یہ جان لیتی کہ میرے پروردگار نے مجھے (میری) مغفرت کا کیسا اچھا صلہ دیا ہے اور مجھے (اپنے) باعزت بندوں میں شامل کر لیا ہے۔ اور ہم نے اس (کی شہادت) کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر (سزا دینے کے لئے) نہیں اتارا اور نہ ہی اس طرح ہم اتارا کرتے ہیں۔ (یہ عذاب) اور کچھ نہیں تھا مگر ایک ہولناک چیخ۔ پس وہ سب وہیں کے وہیں بجھ کر رہ گئے (یعنی ہلاک ہو کر رہ گئے)۔'' (سورۃ یٰسین ۱۳ تا ۳۲)

اصحاب قریہ کون تھے؟، وہ قریہ کونسا تھا جو عذاب الٰہی کا شکار ہوا اور یہ کہ وہ تین رسول کون تھے جو اصحابِ قریہ کی طرف معبوث کئے گئے تھے؟ یہ اگرچہ ایسے سوالات ہیں جن کے بارے میں مختلف آراء ظاہر کی گئی ہیں تاہم میرے نزدیک ان سوالات کی اہمیت اس لئے بھی نہیں ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان سوالات کو کوئی اہمیت نہ دے کر انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

ہمارے لئے تو اس سبق کی اہمیت ہے جو ان آیات میں ہمیں دیا گیا ہے۔

واقعہ اصحاب قریہ کے اہم نکات

راقم کے خیال میں واقعۂ اصحاب قریہ کے درج ذیل نکات بہت اہم ہیں:

(۱) "و اضر ب لهم مثلاً اصحا ب القر ية" کہ قرانی الفاظ سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بطورِ مثال بیان کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں بیان کی گئی بے شمار مثالیں ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے ہی ہیں۔ ان مثالوں سے رہنمائی حاصل کرنا نہ صرف درست ہے بلکہ مستحسن بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کا موجودہ حالات پر منطبق ہونا اعجازِ قرآنی میں اضافہ کا باعث اور قرآن حکیم کے کتابِ زندہ ہونے کا ایک اور اہم ثبوت بن سکتا ہے۔

(۲) اصحابِ قریہ کی طرف مبعوث ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے رسول قرار دیا ہے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سُنت یہ ہے کہ انہیں ہر حال میں غلبہ عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم کی درج ذیل آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِی ؕ/ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۱)

''لکھ دیا ہے اللہ نے کہ ضرور غالب آ کر رہوں گا میں اور میرے رسول بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔'' (المجادلۃ ۲۱)

اللہ کے رسولوں کا اولین مشن دین اللہ کا غلبہ اور فساد فی الارض کا خاتمہ کر کے نظام عدل و قسط قائم کرنا ہوتا ہے۔ (از روئے قرآن سورۃ الحدید آیت ۲۵) اور دین اللہ کے غلبہ کی جدوجہد اُسی وقت کی جاتی ہے جب وہ مغلوب ہو چکا ہوا اور اسے دوبارہ غالب کرنے کی ضرورت ہو۔ پس یہ اسی سنتُ اللہ کا تقاضا تھا کہ اُن رسولوں پر ایمان نہ لانے والی ان کی قوم کو عذاب الٰہی کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

حضور اکرمؐ نے اپنی اُمت کے علماء کو بنی اسرائیل کے انبیاء کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ تو کیا ان علماء میں سے کچھ ایسے بھی نہیں ہوں گے جنہیں رسولوں کی طرح (دین اللہ کی مغلوبیت کے دور میں) نا قابلِ شکست اور غالب رہنے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہو؟

اس سوال کا جواب اگرچہ بہتر طور پر علمائے کرام ہی دے سکتے ہیں تاہم راقم کا ذاتی خیال ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے اور احادیث میں سُرخ آندھیوں، زلزلوں، خسف، مسخ اور سنگباری وغیرہ کے جن عذاب ہائے الٰہی کی خبر دی گئی ہے، اُن کے نزول کے وقت جو اہم ترین رہنما اُمت میں موجود ہوں گے، ممکنہ عذاب الٰہی کے متعلق قوم کو پیشگی خبردار کریں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دین اللہ کے غلبہ کی جدوجہد کر رہے ہوں گے یا با الفاظِ دیگر کارِ رسالت ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے، انہیں رسولوں کی طرح غالب اور نا قابلِ شکست رہنے والے اور کارِ رسالت ادا کرنے کوشش کرنے والے رہنما قرار دیا جا سکتا ہے۔ قرانِ کریم کی یہ آیت اسی امر کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا/ (۱۵)

''اور نہیں ہیں، ہم عذاب دینے والے یہاں تک کہ (نہ) بھیج دیں ہم کوئی رسول۔''

(بنی اسرائیل ۱۵)

مزید برآں قرآن حکیم کی درج ذیل آیات بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں:

اا اور بے شک ہمارا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے اپنے اُن بندوں کے بارے میں جنہیں ہم نے رسول بنا کر بھیجا کہ یقیناً اُن کی ضرور نصرت فرمائی جائے گی اور یقیناً ہمارے ہی لشکر ضرور غالب ہو کر رہیں گے۔ پس (اے نبی ﷺ) انہیں کچھ مُدت کیلئے اُن کے حال پر چھوڑ دیجئے اور اُن کی طرف دیکھتے رہیے، پس عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے، تو کیا یہ ہمارے عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں؟ پھر جب وہ (عذاب) اُن کے صحن میں آ اُترے گا تو اُن لوگوں کا حال بہت برا ہو گا جنہیں (عذاب سے) متنبہ کیا جا رہا ہے۔اا (الصّٰفّٰت ۱۷۱ تا ۱۷۷)

(۳) جس وقت اس بستی کی طرف رسول بھیجے گئے، وہ بستی اس حد تک گمراہی، پستی اور تنزل کا شکار ہو چکی تھی کہ اللہ کے تین رسول بیک وقت معبوث ہونے کے باوجود بھی وہ اس بستی کی حالت سدھارنے اور اس کے مکینوں کو راہِ راست پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ان رسولوں کو جھوٹا اور عام انسان قرار دے کر ان پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ سورہ یٰسین کو نازک ترین و مایوس کن حالات میں بالخصوص حالتِ نزع میں تلاوت کرنے کی نصیحت غالباً اس لئے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین رسول انتہائی مایوس کن حالات میں بھی کارِ رسالت انجام دیتے رہے تھے۔ خود نبی کریم ﷺ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر اسی سورۃ مبارکہ کی

تلاوت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تھے۔

(۴) اس بستی کے لوگ ذاتِ باری تعالیٰ کے منکر نہ تھے بلکہ رحمٰن کے نام سے ہی سہی، ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان بہر کیف رکھتے تھے۔

(۵) اس بستی سے باہر یا اس کے آخری کنارے پر ایک نیک سیرت اور کم از کم عقائد کی حد تک راہِ راست پر قائم شخص بھی موجود تھا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی طرف سے سالہا سال کی دعوتِ حق کی جدوجہد سے اس نے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے اپنی مخصوص درویشی کی سی زندگی اختیار کئے رکھی۔ اس مردِ درویش سے بستی کے لوگ نہ صرف آشنا تھے بلکہ اس کی توقیر و تعظیم بھی کیا کرتے تھے ۔لیکن جب اس مردِ درویش نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے اپنی بستی میں معبوث ہونے والے رسولوں کی حمایت میں زبان کھولی اور ان کے برحق ہونے کا اپنی قوم کو یقین دلایا تو بستی کے زور آور لوگوں نے اسے شہید کر دیا تا کہ اس کی صدائے حق کی گونج سے بستی کے عام لوگ متاثر نہ ہو سکیں۔

آیت نمبر ۲۷ کے الفاظ ۱۱ بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرّمین ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ مردِ درویش نے ایک طویل عرصہ تک اختیار کی جانے والی غیر جانبداری کی پالیسی سے رجوع کرتے ہوئے اپنے اس طرزِ عمل پر اللہ تعالیٰ سے استغفار بھی طلب کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے بھی نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اُسے شہادتِ عظمیٰ سے سرفراز فرما کر اپنے باعزت بندوں میں بھی شامل کر لیا۔

(۶) معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی کے لوگوں کی کچھ تعداد نظامِ عدل وقسط کے داعی ''رسولوں'' کے متعلق دلی ہمدردی تو رکھتی تھی تاہم اپنے عمائدین کے خوف سے رسولوں کا ساتھ دینے سے گریزاں تھی کیونکہ ان کے عمائدین ان رسولوں کے سخت مخالف تھے اور انہیں سنگسار کرنے کے درپے ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان رسولوں کے حق میں صدا بلند کرنے والے مردِ درویش کو شہید کر دیا گیا تو اس نے جنت میں داخلے پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کو دیکھتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا کہ میری قوم کے لوگ میری طرح رسولوں کا کھلم کھلا ساتھ نہ دینے اور موت کے ڈر کی وجہ سے ان انعامات سے محروم رہے جو اللہ تعالیٰ شہیدوں کو عطا فرماتا ہے۔

(۷) رسولوں کا حقیقی مشن اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنا ہوتا ہے جبکہ انبیاء کرام اللہ کے دین کو غالب کرنے کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ان کا کام محض دعوت و تبلیغ کرنا ہی ہوتا ہے۔

گویا رسولوں کی حیثیت دین اللہ کے معماروں کی سی ہوتی ہے جبکہ انبیا کرامؑ کا کام دین اللہ کی اس تعمیر شدہ عمارت کو قائم و دائم (Maintain) رکھنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔ دین اللہ کی عمارت جب حد سے زیادہ بوسیدہ اور شکستہ حال ہو جاتی ہے تو اسے از سرِ نو تعمیر کرنے کے لئے ایک نئے رسول کو مبعوث کر دیا جاتا ہے۔

عذابِ استیصال کے ضمن میں پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر رسولوں کی قوم ان پر ایمان لا کر نظامِ حیات کو دین اللہ کے تابع بنانے سے انکار کر دے تو پہلے مرحلے میں تو اس پر چھوٹے چھوٹے عذاب نازل کئے جاتے ہیں تا کہ وہ عبرت سے کام لیتے ہوئے رسول کی فرماں برداری اختیار کر لے۔ اگر قوم کسی طرح بھی آمادگی اطاعت کے لئے راضی نہ ہو تو اسے بالآخر ہلاک کر دیا جاتا ہے سوائے اُن چند لوگوں کے جو رسولوں پر ایمان لا چکے ہوں۔

اگر قوم کی ایک جماعت رسول کی اعوان و انصار بن کر رسول کے مخالفین سے جہاد و قتال کے لئے تیار ہو جائے تو قوم پر عذابِ الٰہی تو نہیں آتا البتہ رسول کی دعوت کے مخالفین کو جہاد و قتال کے ذریعے اپنے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کی دعوت پر لبیک کہنے والے درحقیقت اپنا جان و مال سب کچھ رسول کے حوالے کر دیتے ہیں اور خود سپردگی کی اس حالت کا نام ' بیعتِ سمع و طاعت' ہے جو ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کے لئے لی جاتی ہے اور جس کا حکم حضور ﷺ نے بھی اپنی اُمت کو دے رکھا ہے۔

(۸) اصحاب قریہ کے واقعہ میں آپ پڑھ چکے ہوں گے کہ بستی والوں نے رسولوں سے کہا تھا کہ ''تمہاری نحوست کی وجہ سے ہم پر تکالیف و پریشانیاں نازل ہوئی ہیں۔'' یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تھی کہ رسولوں کی آمد کے بعد بستی پر چھوٹے چھوٹے عذاب نازل ہوئے تھے اور بستی والے اپنے اعمالِ بد کی اصلاح کی بجائے ان عذاب ہائے الٰہی کو رسولوں کی نحوست قرار دے رہے تھے۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ رسولوں کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اُن کی طرف بھیجے گئے دین اللہ کو قبول و نافذ کرتے۔ مگر نہ تو قوم کے سردار ہی دین اللہ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوئے اور نہ ہی عوام میں سے کوئی ایسی جماعت تیار ہوئی جو رسولوں کے مشن کی تکمیل کے لئے اپنے جان و مال کے ساتھ ان کے اس مشن میں شریک ہوتی۔ فقط ایک مردِ درویش اٹھا اور اسے بھی فوراً شہید کر کے قوم عذابِ الٰہی کی مستحق بن گئی۔

(۹) مردِ درویش نے رسولوں کے برحق ہونے کی دو بڑی وجوہات اپنی قوم کے سامنے بیان کی تھیں: اول یہ کہ وہ اپنی دعوت و تبلیغ کا کسی سے اجر طلب نہیں کرتے اور دوم یہ کہ وہ ہدایت یعنی صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ دونوں شرائط پوری کرنے والا شخص ہی حقیقی داعیءِ اسلام ہو سکتا ہے۔

پس جو شخص صرف اور صرف صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے والا ہو اور لوگوں سے کسی قسم کے مفاد کا طالب بھی نہ ہو، وہی حقیقی معنوں میں لوگوں کا رہنما، مربی، مزکی، مرشد یا امام کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

(۱۰) اصحاب قریہ پر جو عذاب نازل کیا گیا تھا، اُس کی نوعیت کیا تھی؟

قرآن حکیم میں اس کیلئے 'صیحة' یعنی فقط ایک چنگھاڑ کا لفظ ہی آیا ہے۔ ایسی ہی ایک چنگھاڑ کی آواز ہمارے ملک پاکستان میں آنے والے حالیہ زلزلہ سے قبل بھی سُنی گئی تھی جس نے چند منٹوں کے اندر بے شمار بستیوں کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔

ایسی ہی چنگھاڑ زمین کے خسف (دھنس جانے) کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصحاب قریہ کی بستی کو بھی خسف کے عذاب سے ہی دوچار کیا گیا ہو اور وہ بستی صفحۂ ہستی سے ہی غائب ہو گئی ہو۔ شاید اسی لئے اُس بستی کے متعلق مستند معلومات اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔

واقعہ اصحاب قریہ کے مطالعہ سے جنم لینے والے سوالات

دیانت دارانہ طور پر غور کریں تو اصحاب قریہ کے واقعہ کی روشنی میں بیان کئے گئے درج بالا تمام نکات اُمتِ مسلمہ کی موجودہ حالتِ زار پر منطبق ہوتے ہیں۔

کیا اس مطالعہ کے نتیجہ میں درج ذیل سوالات ہمارے ذہنوں میں پیدا نہیں ہوتے؟

(۱) کیا اس وقت جب کہ دین اللہ مغلوب ہو چکا ہے تو اُس کے غلبہ کی جدوجہد کرنے والے رہنما اُمت کے اندر موجود ہیں یا نہیں؟

(۲) کیا اس وقت اُمت مسلمہ بھی پستی وتنزل کی اُس انتہا کو نہیں پہنچ چکی ہے جس کا ذکر اس واقعہ میں کیا گیا ہے؟

(۳) کیا وہ دور نہیں آچکا ہے جس کی خبر آنحضورؐ نے بھی دی تھی کہ سچے کو جھوٹا سمجھا جائے گا اور جھوٹے کو سچا؟ (عن ابو ہریرہؓ رواہ ابن ماجہ) اور جیسا کہ اصحاب قریہ نے اپنے رسولوں کو جھوٹا قرار دے دیا تھا۔

(۴) کیا اصحاب قریہ کی طرح ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے باوجود اُمت کی ایک بڑی تعداد مختلف نوع کے شرک میں مبتلا نہیں ہو چکی ہے؟ اور یہ کہ وہ اللہ کی صفتِ رحمانیت کے متعلق اپنے آپ کو بے جا دھوکے میں ڈال کر بدعملی اور بے عملی کی راہ پر نہیں چل رہی ہے؟

(۵) کیا اس وقت اُمت میں نیک اور اپنے عقائد کو شرک وغیرہ کی آلودگیوں سے پاک رکھنے والے درویش صفت لوگوں کی بھی ایک معتد بہ تعداد موجود نہیں ہے؟

(٦) کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے لوگ امت میں سے مفقود ہو چکے ہیں؟ حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور اس کی خاطر قیامت تک جہاد و قتال کرتا رہے گا'' (عن حضرت ثوبانؓ رواہ مسلم ومغیرہ بن شعبہؓ رواہ بخاری)

(۷) کیا وہ مجاہدینِ اسلام جو دین اللہ کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، وہ اُمت کی دلی ہمدردیاں رکھتے ہیں یا اس سے محروم ہیں؟

(۸) کیا اس وقت اُمت رسول اللہؐ کے فرمان کے مطابق دنیا کی محبت میں گرفتار اور موت کے خوف (یعنی قارونیت سے ملتے جلتے مرض وھن) کا شکار نہیں ہو چکی ہے؟ (عن حضرت ثوبانؓ رواہ ابوداؤد)

اور یہ کہ اُمت مسلمہ شہادت کے فضائل خوب جاننے کے باوجود طاغوتی قوتوں کے برسرِ پیکار مجاہدینِ اسلام کے ساتھ مل کر عالمِ کفر سے مقابلہ سے کنی نہیں کترا رہی ہے؟

ان تمام سوالات کا جواب اور اُمت مسلمہ کی موجودہ حالت زار کی اصل وجہ میرے نزدیک ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُمت اپنے فریضہ ''شہادت علی الناس'' (پوری نوع انسانی کے لئے دین اللہ کے برحق ہونے کی گواہی دینے کے فریضہ) اور اس کے عملی مظاہرے کے لئے ''فریضہ اقامتِ دین'' کو یا تو فراموش کر چکی ہے یا اس کے متعلق اختلاف کا شکار ہو چکی ہے یا اسے محض ایک اضافی نیکی تصور کرتی ہے اور یا پھر اس فریضہ کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود اس کی ادائیگی کے لئے درکار قربانیاں دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔

حالانکہ '' انْ اَقِيْمُوْ الدين و لا تتفرقوا فيه'' (سورۃ الشوریٰ ۱۳) کے الفاظ کے ذریعے اُمت کو دین اللہ کو قائم رکھنے (اور اگر قائم نہ ہو تو اسے دوبارہ قائم کرنے کے) بارے میں اختلاف اور فرقہ بندی سے بھی منع کیا گیا ہے جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے دین اللہ کو اہل کتاب کی طرح ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر گُروہ اپنے ہی حال میں مگن ہے جیسا کہ درج ذیل آیت قرآنی میں فرمایا گیا ہے:

"پس اُنہوں (اہل کتاب) نے اپنے امر (دین اللہ) کو باہم ٹکڑے ٹکڑے کر لیا، ہر گروہ جو کچھ اُسکے پاس ہے، اُسی پر فرحاں وشاداں ہے"۔(المومنون ۵۳)

لیکن ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ نبی آخرالزماں حضرت محمدؐ کی یہ اُمت آخری اُمت ہے لہٰذا اس کا انجام بحیثیت مجموعی سابقہ اُمتوں کی طرح نہیں ہوگا۔ بلکہ سابقہ امتوں پر پیش آنے والے تمام احوال سے گزرنے کے باوجود یہ اُمت بالآخر اپنے ''فریضہ شہادت علی الناس'' اور ''فریضہ اقامتِ دین وغلبۂ دین'' کو ادا کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی جیسا کہ آنحضورؐ نے ظہورِ حضرت مہدیؒ اور نزولِ عیسیٰؑ کی پیشگوئیوں کے ضمن میں خبر دے رکھی ہے۔

آج جب کہ دین اللہ مکمل طور پر مغلوب ہو چکا ہے تو ہم سے ہر فرد اپنے آپ کا بغور جائزہ لے کہ وہ اس اجتماعی فریضہ کی ادائیگی کے لئے کتنی جدوجہد کر رہا ہے، کس قدر قربانی دے رہا ہے یا پھر دینے کیلئے تیار ہے؟

فریضہ اقامت دین کی جدوجہد میں حسب استطاعت حصہ لے کر ہی ہم میں سے ہر فرد اُس عذاب الیم سے چھٹکارہ پا سکتا ہے جس کا ذکر درج ذیل آیات قرآنی میں کیا گیا ہے:

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (١٠) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ/ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط/ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (١١)

اا اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کے متعلق آگاہ نہ کر دوں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے دے؟ (اور وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ تمہارا یہ عمل تمھارے اپنے لئے ہی خیر ثابت ہوگا اگر تم (اس حقیقت کو) جانو۔اا

(الصّف ۱۰ تا ۱۱)

اُمت مسلمہ کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں تین کرداروں کا تعین

واقعہ اصحابِ قریہ کے تناظر میں اُمتِ مسلمہ کی موجودہ حالتِ زار کو بیان کرنے کے بعد راقم کا اصل موضوع اُن چار کرداروں کا تعین ہے جو اس واقعہ میں ''تین رسولوں اور ایک مردِ درویش'' کی صورت میں بیان کئے گئے ہیں۔

تین رسولوں سے مراد راقم کے خیال میں تین ایسے ''مصلحین اُمت'' ہیں جو اقامت وغلبہ دین کی جدوجہد کریں گے اور ناقابلِ شکست رہیں گے یعنی اللہ کی نصرت سے غلبہ وکامیابی بالآخر ان کے قدم چوم کر رہے گی۔ اور یہ کہ احادیث میں بیان کئے گئے، خسف، مسخ اور سنگباری کے عذاب ان مصلحین اُمت کی مسلسل تکذیب یا اُن کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے ہی نازل ہوں گے اور غالباً واقعۂ اصحابِ قریہ کی طرح اُسی وقت نازل ہوں گے جب ایک دورویش صفت رہنما بھی اُن کے حق میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے قولی اور یا پھر عملی طور پر بھی شہادت کا بلند مقام حاصل کر چکا ہوگا۔

راقم کے خیال میں یہ تین مصلحین امت درج ذیل ہو سکتے ہیں:

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد (۲) اسامہ بن لادن (۳) امیر المومنین ملا عمر مجاہد

یہ تینوں رہنما عالم اسلام کے اُمّ القریٰ ممالک یعنی پاکستان، سعودی عرب اور افغانستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

اہم ترین بات جو ان تینوں رہنماؤں کے مابین مشترک ہے، وہ ہے اُن کا کارِ رسالت ادا کرنے کی کوشش کرنا یعنی دین اللہ کے غلبہ کی جدوجہد کرنا اور رخصت و مصلحت پسندی سے گریز کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے راہِ عزیمت اختیار کرنا جو اللہ کے رسولوں کا خاص طُرہ امتیاز ہوتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ راہِ عزیمت کیا ہے؟

راہِ عزیمت دراصل راہِ استقامت ہے اور راہِ استقامت "اُدۡخُلُوۡ فِیۡ السِّلۡمِ کَآفَّۃً" کے قرآنی حکم کے مطابق دینِ اسلام کی مکمل پیروی کا نام ہے اور اسلام کی مکمل پیروی سورۃ والعصر میں بیان کئے گئے چار نکات

(۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق (حق کو دوسروں تک پہچانا) (۴) تواصی بالصبر (حق کو دوسروں تک پہنچانے کی راہ میں آنے والی مشکلات پر نہ صرف خود صبر کرنا بلکہ دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرنا)، پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔

راہِ عزیمت، راہِ استقامت اور دینِ اسلام کی مکمل پیروی کے لئے "جہاد فی سبیل اللہ" ناگزیر ہے خواہ یہ جہاد زبان و قلم کے ذریعے ہو اور یا پھر تلوار کے ذریعے۔

جہاد فی سبیل اللہ کا مقصد طاغوت کی سرکوبی (اللہ کے حکم کے مقابلہ میں اپنا حکم چلانے والا طاغوت کہلاتا ہے)، رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کرنا' اور' انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ان کے رب کی غلامی میں دینا ہوتا ہے۔

لیکن آج عالمِ اسلام کی جو حالت ہے، ہم سب بخوبی جانتے ہیں۔ اللہ کا دین کلی طور پر مغلوب ہو چکا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو اسی لئے بھیجا تھا کہ آپ ﷺ کے دین کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے جیسے کہ تین بار قرآن حکیم میں آپ ﷺ کا مقصد بعثت اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

يُرِيۡدُوۡنَ لِيُطۡفِـئُوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ ط وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ (۸) هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ لا وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ (۹)

"یہ (کافر) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا ڈالیں اور اللہ (کا فیصلہ ہے کہ) وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا۔ وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔" (سورۃ الصّف ۹۔۸)

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ (قرآن کریم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

(سورۃ التوبۃ ۳۳)

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ (قرآن کریم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر گواہی اور اس مشن کی تکمیل کے لئے مددگار کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔" (الفتح ۲۸)

دین اللہ کے عالمی غلبہ تک ہمیں عالمِ کفر کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات میں فرمایا گیا:

"اور اُن (کافروں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کیلئے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں (دین اللہ سے سرکشی سے) تو کوئی زیادتی نہیں مگر صرف ظالموں پر۔" (البقرۃ ۱۹۳)

" اور اُن (کافروں) سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ (فساد فی الارض کا) فتنہ باقی نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔" (الانفال ۳۹)

"(اے مسلمانو)! جنگ کرو اُن لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر، اور حرام نہیں مانتے اُن چیزوں کو جنہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے اُن لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی تھی (ان کے ساتھ جنگ جاری رکھو) حتیٰ کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔" (التوبۃ ۲۹)

حضور اکرم ﷺ نے غلبہء دین کا یہ فریضہ اپنی اُمت کے سپرد کر دیا تھا لیکن آج اُمت کا اس دین کے متعلق رویہ کیا ہے؟ اُمت کی عظیم اکثریت موجودہ عالمی طاغوتی نظام کو نہ صرف ذہناً قبول کر چکی ہے بلکہ عملاً اس کا حصہ بھی بن چکی ہے۔

راقم کو اُن لوگوں (بالخصوص مذہبی رہنماؤں کے سادہ لوحی پر مبنی) بیانات پر بہت افسوس ہوا تھا جنہوں نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں عالم اسلام کیلئے ایک مستقل نشست کا مطالبہ کیا تھا حالانکہ ہمارا اصل مشن تو طاغوتی نظام کے اس محافظ ادارے کو صفحہ ہستی سے مٹا کر دین اللہ کو پورے کُرہ ارض پر نافذ کرنا ہے۔

موجودہ عالمی طاغوتی نظام کو تسلیم کرنا، اس کا حصہ بننا، اس کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرنا اور اس کے خلاف عملی جدوجہد نہ کرنا، درحقیقت اس طاغوتی نظام کی تائید کرنا یا اسے تقویت فراہم کرنا ہی ہے۔

جن تین مصلحین اُمت کا راقم ذکر کر چکا ہے، اُن تینوں کا کارنامہ اس عالمی طاغوتی نظام کو قبول نہ کرنا اور اسے چیلنج کرتے ہوئے دین اللہ کو قائم و غالب کرنے کی جدوجہد کرنا ہے جس کے مظاہر

درج ذیل بیان کئے جاسکتے ہیں:

(۱) اُسامہ بن لادن نے طاغوتی نظام کے محافظ ادارے یعنی اقوامِ متحدہ کے فورم اور اسکے مینڈیٹ کے ذریعے جزیرۃ العرب میں اتحادی افواج کے داخلے کو مسترد کرتے ہوئے امریکہ و یورپ کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔

(۲) محترم ڈاکٹر اسرار احمد، اس طاغوتی نظام کا نہ صرف یہ کہ حصہ نہیں بنے بلکہ اُنہوں نے ''تحریکِ خلافت'' برپا کی تاکہ طاغوتی نظام کا خاتمہ کر کے 'ادارۂ خلافت' کے ذریعے دین اللہ کو نافذ و غالب کیا جاسکے۔

(۳) طالبان کے امیر ملا عمر مجاہد نے اپنے ملک میں اسلامی قوانین نافذ کئے اور کابل پر قبضہ کے فوراً بعد اقوامِ متحدہ کے دفتر میں پناہ لئے ہوئے، افغان قوم کے مجرم، سابق صدر نجیب اللہ کو تختۂ دار پر لٹکا کر عالمی طاغوتی نظام کے محافظ ادارے ''اقوامِ متحدہ'' کے قوانین کو تسلیم نہ کرنے کا خاموش اعلان کیا۔

ان تین مصلحین اُمت میں سے اول الذّکر دو شخصیات یعنی ڈاکٹر اسرار احمد اور اُسامہ بن لادن، اصحاب قریہ کے ابتدائی دو رسولوں کی مثال پر پوری اُترتی ہیں جنہوں نے ۴، اگست ۱۹۹۰ء کو اُمتِ مسلمہ پر ٹوٹنے والی قیامت (یعنی کویت کی آزادی کے بہانے امریکی و یورپی افواج کے جزیرۃ العرب میں داخلے کا عمل جس سے قرآن و حدیث کے احکامات کی صریح خلاف ورزی ہوئی تھی)، کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کے تحت میدانِ عمل میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

تاریخِ اسلام میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ غیر مسلم افواج جزیرۃ العرب میں داخل ہو کر وہاں متمکن ہوگئی تھیں اور سعودی قوم کا تمکن فی الارض (اپنی سرزمین پر اپنی آزاد حکومت چلانے کا حق) عملاً ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ بظاہر یہی کہا گیا تھا کہ ان افواج کو کویت اور سعودی عرب وغیرہ عرب ممالک نے طلب کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار، بزدلی اور کج فہمی نے ہی ان افواج کو موقع دیا تھا کہ وہ جزیرۃ العرب کی سرزمین میں اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کیلئے داخل ہوں۔

اس حقیقت کی خبر حضور اکرم ﷺ نے اس طرح دی تھی کہ ''(ایک وقت وہ بھی آئے گا جب) دین اسلام صرف سرزمینِ حجاز تک سمٹ کر رہ جائے گا۔''

(عن ابو ہریرہؓ رواہ ترمذی و ابن ماجہ)

چنانچہ ہم نے دیکھ لیا کہ اتحادی افواج اُس وقت حجاز مقدس میں داخلہ کی جرائت نہ کر سکی تھیں لہذا سعودی عرب کا صرف یہی مقدس علاقہ غیر ملکی افواج کے براہ راست اثر و رسوخ اور عمل دخل سے محفوظ رہ سکا تھا۔

تاہم سرزمینِ عرب میں اتحادی افواج کا داخلہ ہی اُمت مسلمہ کے لئے ایک عظیم ترین المیہ تھا مگر بہت سے لوگ تو اس المیے کو کوئی خاص اہمیت دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔

مجاہد اسلام (اُسامہ بن لادن)

چونکہ سعودی حکومت عملاً امریکہ کے تابع فرمان ہو چکی تھی اور کلمہ حق کہنے والوں کی زبانوں کو نہ صرف تالے لگا دیے گئے تھے بلکہ بہت سوں کو تو نشانِ عبرت بھی بنا دیا گیا تھا اور کلمہ حق بلند کرنے والے مجاہدِ اسلام اُسامہ بن لادن کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو چکا تھا لہٰذا انہوں نے سنتِ موسویؑ پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۹۱ء میں سوڈان کی طرف ہجرت کر لی جہاں کے اسلام پسند رہنماؤں ''عمر البشیر'' اور ''حسن ترابی'' نے انہیں پناہ عطا کی۔

اُسامہ بن لادن نے سوڈان کو اپنا مرکز بناتے ہوئے امریکہ کے خلاف محاذ جنگ کھول دیا اور ''القاعدہ'' نامی تنظیم کے ذریعے دنیا بھر کے مجاہدینِ اسلام بالخصوص افغان جہاد کے دوران جنگی مہارت حاصل کئے ہوئے لوگوں کو منظّم کرنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے امریکا کا مقابلہ کرنے کے لئے ایٹمی صلاحیت کے حصول کی کوششیں بھی کیں جو غالباً کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔

مزید برآں اُنہوں نے امریکہ کے خلاف ایک متنازعہ فتویٰ بھی جاری کر دیا۔

اُسامہ بن لادن کا اجتہاد یہ تھا کہ امریکہ جزیرہ العرب میں اپنی افواج اتار کر عالمِ اسلام کے خلاف گویا اعلانِ جنگ کر چکا ہے لہٰذا اس کے خلاف جہاد واجب ہو چکا ہے اور اسکا فی الوقت واحد ممکن العمل طریقہ کار یہی ہے کہ

'' امریکیوں پر جہاں بھی بس چلے، حملہ کر کے انہیں ہلاک کر دیا جائے۔''

مگر اُمتِ مسلمہ کی اکثریت نے اس فتویٰ کو قبول نہ کرتے ہوئے بدستور امریکی غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہنے رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔

اہلِ علم بتائیں کہ اس کے علاوہ امریکہ کے خلاف جنگ کا ممکن العمل حربہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ اگر ہم میں سے کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ پہلے امریکہ کے مقابلے کی فوجی قوت حاصل کرنی چاہئے تھی تو اُن سے میرا سوال ہے کہ جب تک اُمت مسلمہ امریکہ کے مقابلہ کی فوجی قوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی، اُس وقت تک خود امریکہ مزید کتنی قوت حاصل کر چکا ہوتا اور مزید کتنے جدید ترین جنگی ہتھیار بنا چکا ہوتا؟

بعض لوگوں کے خیال میں مسلمان ممالک کے حکمران متحد ہو جائیں تو وہ امریکہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں جبکہ ایسا ہونے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ مسلم ممالک کے اکثر و بیشتر حکمران مغربی و امریکی سامراج کے ذہنی و عملی غلام بن چکے ہیں اور انکی قائم کردہ نام نہاد آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) انگریزی کے محاورے (Oh i see) اور فارسی کے محاورے (نشستند، گفتند، برخاستند) کا عملی مصداق بن چکی ہے۔

پس ان ہنگامی حالات کی سنگینی کو مدنظر رکھتے ہوئے علمائے وقت کو چاہئے تھا کہ وہ اُسامہ بن لادن کے اس فتویٰ کو اپنا موضوعِ بحث بناتے اور اس کے جواز کی تشریح کرتے۔

مگر افسوس علمائے وقت اور مسلمان حکمرانوں نے اس فتویٰ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا حالانکہ اُسامہ بن لادن کا فتویٰ بالکل بے بنیاد بھی نہیں تھا۔

اس فتویٰ کی بنیاد یہ تھی کہ موجودہ جمہوری دور میں سویلین افراد بھی اپنی حکومتوں میں اپنے حقِ رائے دہی یعنی ووٹ کی قوت (Vote Power) کے ذریعے شریکِ کار ہوتے ہیں لہٰذا وہ بھی

اپنی حکومتوں کے جرائم میں حصہ دار قرار پاتے ہیں۔

منصفانہ طور پر جائزہ لیا جائے تو اسامہ بن لادن کا یہ فتویٰ اور اجتہاد سو فیصد درست نہ سہی، اپنے اندر کسی حد تک وزن ضرور رکھتا ہے۔

مزید برآں اگر از روئے شریعت ''اضطراری کیفیات'' میں بقدرِ ضرورت حرام اشیاء حلال قرار دی جاسکتی ہیں تو اُمت کی موجودہ ناگفتہ بہ حالتِ زار کو اضطراری کیفیت قرار کیوں نہیں دیا جا سکتا؟

اور اگر اُمت کی موجودہ حالت ''اضطراری کیفیت'' ہی ہے تو اس بناء پر بھی اسامہ بن لادن کا فتویٰ درست قرار پاسکتا ہے۔

فرض کیجئے اسامہ بن لادن کے اس فتویٰ کو پوری اُمت تسلیم کر لیتی اور اس کے مطابق اقدامات کرتی تو امریکہ امت مسلمہ کے خلاف اپنا موجودہ جارحانہ طرزِ عمل جاری رکھ سکتا تھا؟

یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ دنیا بھر کے مسلمان ہر جگہ امریکیوں کا جینا حرام کر دیتے اور نتیجتاً امریکہ کو عالمِ اسلام کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے۔

بلاشبہ چند شرائط کے ساتھ اسامہ بن لادن کے فتویٰ کو جائز قرار دیا جاسکتا تھا مگر اصل مسئلہ اور رونا تو اس بات کا ہے کہ اُمت کے پاس وہ اتھارٹی یا ادارہ ہی موجود نہیں تھا جو اس فتویٰ کو حقیقی سندِ جواز عطا کر سکتا۔

یقیناً ''ادارۂ خلافت'' ہی اس فتویٰ کو حقیقی سندِ جواز عطا کر سکتا تھا اور اس پر ایک مناسب طریقہ کار کے مطابق عمل درآمد کو بھی یقینی بنا سکتا تھا۔

دین اللہ پر گرنے والی پانچ قیامتیں

نہایت افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۲۴ء میں ختم ہو جانے والا ''ادارۂ خلافت'' ابھی تک بحال نہیں ہو سکا اور اُمت اپنی وحدت کے اس نشان سے محروم ہونے کی وجہ سے مسلسل پستی و تنزل کی کھائی میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ جس ادارۂ خلافت کی حفاظت کے لئے چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ نے جزائرِ مالٹا میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں، اسے بحال کرنے کی کوئی سنجیدہ جدوجہد ان کے شاگردوں اور مکتبۂ فکر سے بھی نہ کی جا سکی بلکہ اُلٹا شیخ الہند کے اپنے ہی مکتبۂ فکر نے تقسیم در تقسیم ہو کر اپنی توجہات سطحی امور پر مرکوز کر دیں حالانکہ خلافتِ عثمانیہ کے بعد اُمت اور اُس کے دین اللہ پر مسلسل قیامتیں ٹوٹتی رہیں۔

یہ قیامتیں رُوئے زمین سے اللہ کی اتھارٹی یعنی ''مُلک اللہ یا دین اللہ'' کے بتدریج خاتمے اور طاغوتی نظام کے اس پورے کرۂ ارض پر چھا جانے کی صورت میں ظاہر ہوئیں مگر بہت سے لوگوں کے تو نزدیک ان کی کوئی اہمیت ہی نہ ہوگی بلکہ اکثر لوگ تو انکی حقیقت سے بالکل غافل ہی ہوں گے۔

پہلی قیامت

بھارتی دانشور ''اسرار عالم'' نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کو دورِ حاضر میں اُمت مسلمہ پر ٹوٹنے والی قیامتوں میں سے اولین قیامت قرار دیا ہے جب اُمت اپنی وحدت و مرکزیت کے اس واحد نشان سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ (بحوالہ دجّال، جلد سوم)

دوسری قیامت

اُن کے نزدیک برطانوی حکومت کی طرف سے ۱۹۳۱ء میں پاس کئے جانے والے ایک قانون (The Statute of Westminster) کے تحت دولتِ مشترکہ (The Common wealth) کا قیام تھا جس میں اکثر و بیشتر مسلم ممالک دین اللہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے شریک ہو گئے تھے۔

تیسری قیامت

اُن کے نزدیک ۱۹۴۵ء میں عالمی ادارے مجلسِ اقوامِ متحدہ (The United Nation's Organisation) کا قیام اور مسلم ممالک کا اس میں شریک ہو جانا تھا۔

اسرار عالم صاحب کہتے ہیں! ''وہ تمام مسلم ممالک جو اس اتھارٹی (اقوام متحدہ) کے قیام میں پیش پیش رہے یا بعد میں اس اتھارٹی میں شامل ہو گئے وہ ''ملک اللہ'' اور ''دین اللہ'' سے مرتد اور اس کے سخت باغی ہیں، انہوں نے ایسا کر کے روئے ارض پر طغیان برپا کیا ہے۔''

اسرار عالم صاحب کا خیال سو فیصد درست ہو یا نہ ہو، اس حقیقت سے تو کوئی باشعور مسلمان اختلاف نہیں کر سکتا کہ اس اتھارٹی یعنی اقوام متحدہ نے کم از کم عالمِ اسلام کے لئے کوئی مثبت خدمت اب تک انجام نہیں دی ہے جبکہ عالم اسلام کے حوالہ سے اس کے منفی کارنامے بے شمار بیان کئے جا سکتے ہیں۔

چوتھی قیامت

اُن کے نزدیک ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی ناجائز ریاست کا قیام تھا۔ اگرچہ اسرائیل کو اکثر اسلامی ملکوں نے تسلیم نہیں کیا تھا تاہم اصل سوال یہ ہے کہ انہوں نے اسرائیل کا قیام برداشت کیونکر کیا تھا حالانکہ فتح بیت المقدس کے وقت حضرت عمرؓ کے ہاتھوں لکھے جانے والے صلحنامے کے تحت ارض فلسطین میں یہودیوں کو مستقل آباد ہونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

لیکن اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک اس غیر قانونی ریاست کو تسلیم کر چکے ہیں اور پاکستان و سعودی عرب سمیت کئی مزید ممالک اسے تسلیم کرنے کا عندیہ دے چکے ہیں۔

پانچویں قیامت

اسرار عالم صاحب کے نزدیک ۱۹۹۰ء میں اتحادی افواج کا جزیرۃ العرب کی سرزمین میں داخل ہونا تھا جس کی وضاحت راقم پہلے ہی کر چکا ہے کہ اُس وقت کچھ نہ کچھ شرعی قوانین کی حامل واحد

مسلم ریاست سعودی عرب بھی اپنے حقیقی تمکن سے محروم ہوگئی تھی۔

راقم کے خیال میں دین اللہ پر گرنے والی ان قیامتوں پر ٹس سے مس نہ ہونے کی وجہ سے ہی مسلمانوں پر آئے روز کوئی نہ کوئی قیامت گرتی رہتی ہے جبکہ مستقبل کی تین قیامتیں، زمین کے تین خسوف کی صورت میں ہماری راہ تک رہی ہیں۔

مگر ان تمام تر کٹھن اور قیامت خیز حالات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اقامت دین کی دعویدار جماعت اسلامی اور شیخ الہندؒ سے نسبت رکھنے والے مکتبۂ فکر سے ''ادارۂ خلافت'' کی بحالی کے لئے کوئی لائحہ عمل و تحریک منظرِ عام پر نہ آسکی۔ جماعت اسلامی نے 'اقامت دین' اور شیخ الہند کے مکتبہ فکر نے 'وحدتِ اُمت' کے تصورات کو تو اگرچہ زندہ رکھا تاہم وحدت اُمت کے حقیقی نشان اور دین اللہ کے حقیقی محافظ یعنی ادارۂ خلافت کی بحالی کی ضرورت سے اعراض کیے رکھا۔

روح اسلام کے مطابق نظام خلافت کے دوبارہ قائم ہونے کی نبویؐ پیشگوئیوں کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے تحریکِ خلافت برپا کرنے کی کوشش کی تو اُس شخص نے جو طبقۂ علماء میں شامل تھا اور نہ ہی طبقہ ءسیاستدانوں میں یعنی ''ڈاکٹر اسرار احمد''۔

داعیٔ تحریکِ خلافت (ڈاکٹر اسرار احمد)

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں اسلام کے خالص انقلابی فکر پر ''تنظیمِ اسلامی'' قائم تھی جس میں شمولیت کے لئے ''بیعت'' کا مسنون، منصوص اور مأثور طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

انہوں نے اپنی دعوت کا بنیادی ذریعہ قرآن کریم کو بنایا اور یہ حضرت عمرؓ سے مروی اس حدیث کی روشنی میں اختیار کیا گیا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو سربلندی عطا فرمائے گا اور اس قرآن سے روگردانی کی پاداش میں انہیں ذلیل و رسوا کردے گا۔'' (رواہ مسلم)

قرآن کریم کا فہم عام کرنے اور اس کا پیغام عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۲ء میں ''انجمن خدام القرآن'' پہلے ہی قائم کر چکے تھے۔

انہوں نے مطالعۂ قرآن حکیم کا ایک منتخب نصاب بھی ترتیب دیا جس کا مرکز و محور سورۃ والعصر کو بنایا گیا تھا۔ قرآن حکیم کے مقصدِ نزول کے اعتبار سے سورۃ العصر بلاشبہ قرآن کریم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ اس مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب اسی سورۃ کے مضامین کے گرد ہی گھومتا ہے اور ان مضامین کی ہی تشریح در تشریح پر مشتمل ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے بھی مسلمانوں کی ذلت و پستی کی دو بنیادی وجوہات (۱) ان کی قرآن حکیم سے دُوری اور (۲) ان کے باہمی اختلافات بیان کی تھیں۔

انہی دو اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انجمن خدام القرآن اور تنظیمِ اسلامی قائم کی گئی تھی۔ تنظیمِ اسلامی مروجہ مفہوم کے اعتبار سے نہ کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ مذہبی فرقہ بلکہ یہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق کو قائم و غالب کرنا چاہتی ہے اور تمام سنی مکاتبِ فکر کے لوگ اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں عالم اسلام پر ٹوٹنے والی پانچویں قیامت اور ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے دوران عالم اسلام کا سیاسی مرکز و قبلہ یعنی پاکستان کوئی مؤثر کردار ادا کرنے میں ناکام رہا تھا حالانکہ اگر یہاں ایک اسلامی حکومت ہوتی تو وہ اُس موقع پر ایک اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔

سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد تبدیل شدہ عالمی حالات اور اُمت مسلمہ کی سنگین ترین حالت کے تناظر میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ۱۹۹۱ء میں تحریکِ خلافت کا احیاء کیا تھا۔ اُنہوں نے اس ادارۂ خلافت کی بحالی کے لئے عملی طریقۂ کار بھی وضع کیا تھا جس کی تفصیلی وضاحت اُن کی ''منہج انقلابِ نبویؐ'' نامی کتاب میں کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کا طریقۂ کار بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں دورِ حاضر میں (بالخصوص پاکستان میں) اسلامی نظام حکومت کے قیام کا واحد ممکن العمل طریقہ حکمرانوں کے خلاف غیر مسلح بغاوت یا خروج ہے جسے ایک ایسی پُرامن احتجاجی تحریک کا نام بھی دیا جا سکتا ہے جس میں تشدد کی راہ ہرگز اختیار نہیں کی جانی چاہئے ورنہ اس تحریک کو مختلف حیلوں بہانوں کے تحت بآسانی ریاستی مشینری کی اندھی قوت کے ذریعے کچل دیا جائے گا۔

اُن کے خیال میں انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام کا قیام عملی طور پر ممکن نہیں کیونکہ انتخابات پہلے سے موجود نظام کو چلانے کے لئے کروائے جاتے ہیں، اس نظام کو بدلنے کے لئے نہیں۔ انقلابِ ایران اُن کی اس رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ ایران میں جو نظام اِس وقت قائم ہے، کبھی بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہاں انقلاب نہ آجاتا۔ شاہِ ایران ملک میں انتخابات کا ڈھونگ رچا دیتا، تو بھی ایران میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی تھی۔ فقط چند اصطلاحات نافذ ہو جاتیں اور کچھ نئے چہرے میدانِ سیاست کے اُفق پر نمودار ہو جاتے۔

اس سلسلہ میں الجزائر اور ترکی کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ الجزائر میں تو کامیاب ہونے والی اسلامی جماعت کو حکومت ہی نہ بنانے دی گئی تھی جبکہ ترکی میں ایک اسلام پسند جماعت برسر اقتدار آنے کے باوجود عملاً اسلام کے لئے کچھ کرنے سے قاصر رہی۔ صوبہ سرحد میں مجلس عمل کی حکومت کس حد تک نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی کر سکی ہے، سبھی جانتے ہیں۔

پس رائج الوقت نظام کو جڑ سے اکھاڑے بغیر ایک حقیقی اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے ایک پہلے سے موجود عمارت کو مسمار کئے بغیر اُسی جگہ پر ایک نئی عمارت کی تعمیر کا خیال خام۔

مزید برآں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور کا ''عوامی حاکمیت'' کا تصور جسے ہم عام اصطلاح میں ''جمہوریت'' کا نام بھی دیتے ہیں، موجودہ عالمی طاغوتی نظام کا ایک اہم ستون ہے۔ جمہوریت کا مطلب ہم سب جانتے ہی ہیں کہ ''اکثریت کی حکومت'' ہے۔ اکثریت کی حکومت کا یہ تصور قرآنِ حکیم اور دین اسلام کی تعلیمات سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ حضورؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط/ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ/ (۱۱۶)

''اور اگر آپؐ اُن لوگوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے جو زمین میں (بستے) ہیں (تو) وہ آپ کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے (کیونکہ ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ) وہ گمان کی پیروی

کرتے ہیں اور یہ لوگ تو محض قیاس آرائیاں کرنے والے ہیں۔'' (الانعام ۱۱۶)

فریضہ اقامت دین، عبادت رب کا ایک اہم ترین لازمی تقاضہ ہے لیکن جمہوری نظام میں یہ فریضہ اکثریت کی حمائت ورضامندی سے مشروط ہو جاتا ہے حالانکہ عبادت رب کو کسی کی رضامندی سے ہرگز مشروط نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آنحضور ﷺ جزیرۃ العرب میں عامۃ الناس کی رائے لئے بغیر دین اللہ نافذ کرتے اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق ؓ اُس فتنہ ارتداد کو بزور قوت کچلتے جس میں اہل عرب کی اکثریت نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد مبتلا ہو گئی تھی۔

پس ایسا جمہوری نظام جو عملی طور پر دین اللہ کے تابع نہ ہو، درحقیقت طاغوت ہی ہے خواہ اسے اسلامی جمہوریت کا نام ہی کیوں نہ دے دیا جائے۔

تاہم ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اگر کسی ملک میں مکمل اسلامی نظام قائم ہو چکا ہو تو وہاں اُس نظام کو چلانے کے لئے جمہوری طریقہ کار اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ اسلامی نظام میں جمہوریت مادر پدر آزاد نہیں ہوتی بلکہ دین اللہ کے تابع ہوتی ہے۔

دستور پاکستان یا عجل سامری؟

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے نام نہاد اسلامی آئین کی حیثیت بنی اسرائیل کے ایک منافق شخص "سامری" کے تراشے ہوئے بچھڑے کی سی ہے۔ جس طرح سامری نے "بچھڑے" کی پرستش کے شرک کو ایک "اثر رسول" کی آمیزش کے ذریعے مقدس ومتبرک بنا کر بنی اسرائیل کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا، اُسی طرح پاکستان کے سامریوں نے بھی "جمہوریت کے شرک" کو ایک مقدس ومتبرک "قراردادِ مقاصد" کی آمیزش کے ذریعے نہ صرف 'وجہ جواز' عطا کر رکھا ہے بلکہ پاکستان قوم کو بالعموم اور ہمارے سیاستدانوں کو بالخصوص نفاق کے اس پلندہ کو خوش نما بنا کر انہیں ہر وقت جمہوریت، جمہوریت، جمہوریت کی قوالی کرنے میں مگن کر رکھا ہے۔

ہماری مذہبی جماعتوں کا جمہوریت اور نام نہاد آئین کی بحالی کیلئے تو سر توڑ کوششیں کرنا جبکہ نفاذ اسلام کو ثانوی حیثیت دے دینا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بھی جمہوریت کی اس 'مے' کے اُسی طرح سے رسیا ہو چکے ہیں جس طرح کہ وہ سیکولر جماعتیں جنہیں ہمارے غیر ملکی آقاؤں نے اس 'مے نوشی' کا عادی بنا کر ہی آزادی عطا کی تھی۔

جبکہ نام نہاد اسلامی آئین جس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا ہے، کے بارے میں ہم جانتے ہی ہیں کہ یہ کاغذ پر لکھی جانے والی ایک دستاویز ہے نہ کہ بدن وروح کا مرکب ایک انسان جس کے ظاہر و باطن میں فرق ہوسکتا ہو۔ لہذا اس پر جو بھی حکم لگایا جائے گا، اس کے مندرجات کے مطابق ہی لگایا جائے گا۔ جس طرح ایک کتاب یا تو کتاب ہدایت ہوتی ہے اور یا پھر کتاب ضلالت، اُسی طرح کوئی آئین بھی یا تو اسلامی ہوگا اور یا پھر غیر اسلامی۔

ہمارے آئین کا حال یہ ہے کہ اس کے دیباچہ میں تو اقتدار اعلیٰ کا مالک ذات باری تعالیٰ کو تسلیم کیا گیا ہے جبکہ عملاً اکثر وبیشتر قوانین انسانی ذہنوں کی اختراع کے مطابق بنائے گئے ہیں اور اب بھی بنائے جاتے ہیں۔

پس دین اللہ کو عملاً نافذ کیے بغیر ہمارا پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے کا دعویٰ عنداللہ ہرگز قابل قبول نہیں جیسا کہ قرآن حکیم کی درج ذیل آیت اسی حقیقت کا اظہار کرتی ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ/ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ/ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ/ وَالْاِنْجِيْلَ/ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط/

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ/ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ج/ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (٦٨)

۱۱ اے اہل کتاب! تم (اللہ کے ہاں) کسی مقام کے (حامل) نہیں ہو یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل (میں بیان کئے گئے نظام حیات) کو قائم ونافذ کرو اور اُس کے مطابق بھی جو (اے محمد ﷺ) تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اور ضرور اضافہ کرے گا یہ (کلام) سرکشی اور کفر میں اُن میں سے بہت سوں کو۔ پس آپ ﷺ ایسے کافروں پر ہرگز غم نہ کیجئے گا۔۱۱

(سورۃ المائدہ ٦٨)

یقیناً اس آیت کے حقیقی مخاطب اہل قرآن ہی ہیں جن کی طرف یہ کلام اُتارا گیا ہے اگرچہ بظاہر یہاں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہی ہے۔

چونکہ ہمارے ملک میں دین اللہ عملاً نافذ نہیں ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب پاکستان کی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے حصہ لینے کو درست نہیں سمجھتے۔

پاکستان میں دین اللہ کا نفاذ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ دینی جماعتیں انتخابی سیاست سے دستبردار ہو کر ایک پریشر گروپ کی صورت اختیار کریں، اپنے مطالبات منوانے کے لئے پرامن ایجی ٹیشن اور سول نافرمانی کا راستہ اختیار کریں اور اپنے مطالبات کے حصول کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

''قراردادِ مقاصد'' بھی اس طرح ایک پُرامن احتجاجی تحریک کے نتیجہ میں پاس ہوئی تھی اور اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ کوئی مذہبی جماعت بھی اُس وقت تک انتخابی عمل کا حصہ نہیں بنی تھی لہٰذا تمام طبقات نے متفق ومتحد ہو کر اس قرارداد کی حمایت کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ نہ تو مروجہ میدانِ سیاست کے کھلاڑی تھے، نہ باقاعدہ طور پر طبقۂ علماء میں ہی شامل تھے اور نہ ہی کسی مخصوص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا وہ تن تنہا اپنا اسلامی انقلابی فکر جو خالصتاً دینِ اسلام کی تعلیمات پر ہی مشتمل تھا، عملی طور پر نافذ کرنا تو کجا، اس کے لئے ایک مؤثر تحریک چلانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ نتیجتاً اُن کی تحریک خلافت بظاہر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

یقیناً کوئی بھی شخص تن تنہا محض اپنی ذات کے بل بوتے پر کوئی اجتماعی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا حتیٰ کہ اللہ کے رسول بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

قوم نوحؑ، قوم عاد وثمود اور قوم لوطؑ کی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کی دعوت وتبلیغ کے نتیجہ میں چونکہ کوئی ایسی بڑی جماعت وجود میں نہ آسکی جو دین اللہ کے باغیوں کے ساتھ جہاد کا فریضہ ادا کرنے کے قابل ہوتی لہٰذا ان کی قوموں کو عذاب ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔

حضرت موسیٰؑ کی قوم نے چونکہ اکثر وبیشتر امور میں اللہ کے رسول حضرت موسیٰؑ کی طوعاً وکرھاً پیروی کر لی تھی لہٰذا اسے نہ صرف فرعون کی غلامی سے آزاد کروا دیا گیا بلکہ کتاب وشریعت کا حامل بھی بنا دیا گیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ چونکہ صحابہ کرامؓ کی ایک مقدس ترین جماعت بنانے میں کامیاب رہے لہٰذا انہوں نے دین اللہ کے باغیوں کے خلاف اپنے جانثار صحابہؓ کی مدد سے جہاد وقتال کیا اور اس میں کامیاب وکامران بھی رہے۔

دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اُمید کے دو چراغ

ہم میں سے اکثر قارئین کے علم میں یہ حقیقت پہلے سے موجود ہوگی کہ حضورؐ نے عمرو بن ہشام (ابوجہل) اور عمرؓ بن خطاب کے متعلق بارگاہِ خداوندی میں دعا کی تھی کہ ان دونوں میں سے کم از کم ایک کے ذریعے تو ضرور اسلام کو قوت وعزت عطا فرما!۔

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا حضرت عمرؓ بن خطاب کے قبولِ اسلام کی صورت میں قبول فرمائی تھی اور حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے وقت مکۃ المکرّمہ نعرۂ تکبیر کی صدا سے گونج اٹھا تھا اور مسلمان جو علی الاعلان بیت اللہ میں عبادت نہیں کر سکتے تھے، حضرت عمرؓ کے ہمراہ بیت اللہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کے قابل ہو سکے تھے۔

حضور ﷺ نے ان دو اشخاص کے بارے میں دعا اس لئے فرمائی تھی کہ آپؐ سمجھتے تھے کہ یہ دونوں شخصیات اس قدر طاقتور، بااثر اور معزز ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک شخصیت کا بھی قبولِ اسلام، اسلام کے لئے بے حد تقویت کا باعث بنے گا۔

اسی سے ملتے جلتے حالات اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواہش مند وداعی ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ پیش آئے۔ وہ بھی یقیناً اپنے انقلابی فکر پر عمل درآمد کے لئے دوسروں کی مدد کے محتاج تھے لہٰذا انہوں نے بھی دو اہم طبقات فکر یا بالفاظ دیگر دو اہم ترین دینی جماعتوں سے امیدیں وابستہ کیں کہ وہ ان کے فکر کی تعمیل میں ان کی دست وبازو بنیں گے۔

یہ دو طبقات (۱) جماعتِ اسلامی اور (۲) دیوبندی مکتبۂ فکر تھے۔

دیوبندی مکتبۂ فکر کی نمائندہ کئی جماعتیں ہیں مثلاً تبلیغی جماعت اور جمیعت علمائے اسلام۔ یہ تمام جماعتیں یقیناً جماعت شیخ الہندؒ کی وارث بھی قرار پاتی ہیں۔

ان دو طبقات کے متعلق پرامید ہونے کی دو بڑی وجوہات تھیں:

(۱) ان دونوں طبقات میں دین کا ہمہ گیر تصور وشعور دوسروں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۲) ان کی بنیاد فرقہ واریت کی بجائے وحدت اُمت کے تصور پر قائم ہے۔

ان میں سے جماعت اسلامی تو گویا ڈاکٹر صاحب کی اپنی ہی جماعت تھی کیونکہ وہ ایک عرصہ اس جماعت میں گزار چکے تھے لیکن جب یہ جماعت اپنے اولین انقلابی طریقۂ کار کو چھوڑ کر مروجہ سیاسی نظام یا بالفاظِ دیگر طاغوتی نظام کا حصہ بن گئی تھی تو بہت سے دیگر رہنماؤں کی طرح انہوں نے بھی اسے ۱۹۵۷ء میں خیرباد کہہ دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب جماعتِ اسلامی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور اسے دوبارہ اپنے انقلابی طریقۂ کار کی طرف واپس لانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جماعت اسلامی کے حقیقی فکر و مشن کے متعلق کتابیں بھی لکھی تھیں مگر یہ جماعت اپنی اصلاح کے لئے تیار نہ ہو سکی۔

بلکہ اُلٹا ڈاکٹر صاحب کے خلاف معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا جس کا ایک مظہر ''پاسبان تحریک'' کی صورت میں اُن دنوں سامنے آیا جب ڈاکٹر صاحب تحریک خلافت کا آغاز کر چکے تھے۔ ''پاسبان'' کو بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی تحریکِ خلافت کا ''توڑ'' یا اس کی ایک متوازی تحریک قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء کی تمام تر انتخابی ناکامیوں کے باوجود جماعتِ اسلامی اپنی روش تبدیل کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی بلکہ بدستور انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر ہی مُصر رہی حالانکہ بانی جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ناکامی کے بعد ہی مجلسِ شوریٰ کو سیاسی عمل (یعنی انتخابات) سے دست بردار ہو کر انقلابی طریقہ کار اختیار کر لینے کا مشورہ دے چکے تھے۔

مولانا مودودیؒ کے اس مشورہ کو قبول نہ کرنا ہمارے لئے زیادہ حیران کن نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہم جانتے ہی ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے بھی تو اپنے اس رہبر ونجات دہندہ کا حکم رد کرتے ہوئے کفار کے ساتھ جہاد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس طرح قوم موسیٰؑ کو اپنے اس رہبر کی فرماں برداری نہ کرنے کی سزا یہ ملی تھی کہ وہ چالیس سال تک صحرائے سینا میں ہی بھٹکتے رہے تھے، اُسی طرح جماعت اسلامی بھی اُس وقت سے لے کر اب تک مروجہ سیاست کی وادی میں بھٹک رہی ہے لیکن اقامت دین کی منزل کہیں نظر نہیں آ رہی ہے۔

پاسبان تحریک کے دنوں میں راقم خود جماعتِ اسلامی سے وابستہ تھا اور انہی دنوں افغانستان میں خانہ جنگی بھی جاری تھی۔ جماعت اسلامی افغانستان کی سب سے بڑی جہادی تنظیم ''حزبِ اسلامی'' کی اتحادی وپشت پناہ تھی۔ جماعت اسلامی کے رہنما ان دنوں یہ تاثر دے رہے تھے کہ اگر افغانستان میں حزبِ اسلامی کی حکومت قائم ہو گئی تو پاکستان میں جماعتِ اسلامی کو بھی فیصلہ کن قوت حاصل ہو جائے گی لیکن جس انداز سے ''حزبِ اسلامی'' افغانستان میں اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھی اور اس نے اپنے اصل مقصد یعنی نفاذِ اسلام کو ثانوی حیثیت دے رکھی تھی، تو اس کا یہ طرزِ عمل اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ حزبِ اسلامی کو شراکتِ اقتدار کے فارمولوں کی بجائے نفاذِ اسلام کے اپنے اولین ہدف کو ترجیح دینا چاہئے تھی۔

اُن دِنوں راقم کو پاکستان میں اسلامی انقلاب کے امکانات تو کہیں نظر نہ آتے تھے البتہ افغانستان کی خانہ جنگی کے نتیجہ میں ایک ''تیسری قوت'' کے ظہور کا امکان ضرور نظر آتا تھا لہٰذا بفضلِ خدا جب ۱۹۹۴ء میں طالبان تحریک کا ظہور ہوا تو راقم کو اس پر خوشگوار حیرت محسوس ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آج اس کتاب کے لکھنے کی توفیق جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے، میری اُسی دلی آرزو کی بدولت

ہے جو میں نے افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کے متعلق اُن دنوں اپنے دل میں بسائی تھی۔

تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ طالبان تحریک ابتدائی طور پر حزبِ اسلامی کو شکست دے کر ہی منظرِ عام پر آئی تھی حالانکہ حزبِ اسلامی نفاذِ اسلام کی سب سے بڑی علمبردار جماعت تھی مگر چونکہ جماعتِ اسلامی کی طرح حزبِ اسلامی بھی دورِ حاضر کے مروجہ جمہوری نظام کو قبول کرنے پر آمادہ ہو چکی تھی لہٰذا ذاتِ باری تعالیٰ نے اس طرزِ عمل کی بنا پر اسے ممکنہ 'تمکن فی الارض' کے شرف سے محروم کر دیا اور اس کی بجائے ایسے لوگوں کو تمکن عطا کر دیا جو واقعتاً اہلِ عزیمت و استقامت تھے۔ جنہوں نے دورِ حاضر کے طاغوتی نظام کو مسترد کر دیا تھا اور اپنے ملک میں مروجہ جمہوری نظام قائم کرنے کی بجائے دین اللہ کو نافذ کرنے پر توجہ مرکوز کر دی تھی جبکہ حزبِ اسلامی نے اپنے زیرِ قبضہ علاقوں میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے پر ہی ساری توجہ مرکوز کئے رکھی تھی۔

حزبِ اسلامی کی یہ ناکامی درحقیقت جماعتِ اسلامی کی ناکامی کے مترادف ہی تھی اور اسے جماعت اسلامی کے لئے ایک خدائی وارننگ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کا اعزاز طالبان کو کیونکر حاصل ہوا اور حزبِ اسلامی و جماعت اسلامی باوجود تمام تر وسائل اور قوت کے، اس اعزاز سے کیوں محروم رہ گئیں؟

آخر کیا وجہ ہے کہ عالمِ اسلام کی احیائی تحریکوں میں صفِ اول کی اہمیت رکھنے والی یہ جماعتیں اپنے اس مقام و مرتبہ سے محروم ہو گئیں؟

قرآن حکیم اس سوال کا جواب اس طرح سے دیتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً/ اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ/ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ/ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ/ (۵۳)

''یہ جو کچھ ہوا، اس بنا پر ہوا کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں کسی نعمت کو جو اس نے عطا کی ہو کسی قوم کو جب تک کہ وہ خود نہ بدل دیں اپنے طرزِ عمل کو، اور بے شک اللہ ہر بات سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' (سورۃ الانفال ۵۳)

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ/ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۳۸)

'' اور اگر تم منہ موڑ لو گے (تو تمہاری جگہ) وہ (تمہارا مالک) اور لوگوں کو لے آئے گا پھر وہ تمہارے جیسے نہ ہونگے۔'' (سورہ محمد ۳۸)

درج ذیل آیات میں یہی حقیقت زیادہ کھول کر بیان کر دی گئی ہے:

"اے ایمان والوں! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے انحراف کرے گا تو عنقریب اللہ (تمہاری جگہ) ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور انہیں اللہ سے محبت ہوگی (جو) مومنوں پر (تو) مہربان ہوں گے (مگر) کافروں پر سخت، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ (امامت و خلافت کا منصب) اللہ کا فضل ہے، وہ اسے عطا کر دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ وسیع ذرائع کا مالک اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا دوست تو بس اللہ، اسکا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور وہ (اللہ کے حضور) جھکنے والے ہیں اور جو کوئی اللہ کا، اسکے رسول کا اور اہل ایمان کا دوست بن جائے گا تو (آگاہ ہو جاؤ کہ) بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے۔" (المائدہ ۵۶ ۔۵۴)

ان آیات قرآنی کے آئینہ سے نہ صرف پاکستانی قوم کے اسلام کے متعلق اُس مجموعی طرزِ عمل کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اُس نے اُن دنوں اسلام کے متعلق اختیار کر رکھا تھا جن دنوں طالبان تحریک ظہور پزیر ہوئی تھی بلکہ اقامتِ دین کی جدوجہد کی واحد دعویدار جماعت 'جماعت اسلامی' کے طرزِ عمل کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

جماعت اسلامی اپنے انقلابی طریقہ کار سے منحرف ہونے کے علاوہ شرعی امور کے متعلق بھی غیر معمولی لچکدارانہ رویے کا اظہار کرنے لگ گئی تھی جس کا شکوہ کچھ لوگوں کو تو پہلے ہی سے تھا مگر ''پاسبان'' وغیرہ تنظیمیں قائم کر کے شریعت الٰہی سے انحراف و فرار کی جو کوششیں کی گئیں، اُن کا نتیجہ بالآخر جماعتِ اسلامی کے خلاف ہی نکلنا تھا۔

جماعتِ اسلامی کے اربابِ حل وعقد کیلئے مقامِ غور و فکر ہے کہ جو علم اُنکے ہاتھ میں تھا، وہ ایک دوسری جماعت کے پاس کیونکر پہنچا اور وہ اس سے محروم کس طرح ہو گئے؟

ڈاکٹر صاحب کے اخلاص اور جماعت اسلامی کے متعلق خیر خواہی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۵ اگست ۱۹۹۵ء کے خطاب جمعہ میں انہوں نے خود سمیت اپنی تنظیم کو جماعت اسلامی میں مدغم کرنے کی پیشکش کی بشرطیکہ جماعت اسلامی مروجہ سیاسی عمل سے دستبردار ہو کر انقلابی طریقہ کار اختیار کر لے مگر جماعت اسلامی شاید اس حد تک دور جا چکی تھی کہ واپسی کا سوچنا بھی اس کے لئے محال تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

دوسرا اہم ترین طبقہ جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب پُر امید تھے کہ وہ ان کا دست و بازو بنے گا یعنی دیوبندی مکتبۂ فکر (شیخ الہند سے نسبت رکھنے والا مکتبۂ فکر)، بھی بظاہر ڈاکٹر صاحب کا حریف ہی ثابت ہوا۔ اس طبقہ کے بعض لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کو غیر مستند عالمِ دین قرار دے کر مسترد کر دیا۔ ان کے بیعت کے نظام کے خلاف فتوے جاری کئے اور بعض دیگر فروعی اختلافات کو بنیاد بنا کر اُنہیں ہدفِ تنقید بنایا گیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ان کی جماعتِ اسلامی چونکہ اپنی بعض غلطیوں کی وجہ سے دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے فتووں کی زد میں آ چکی تھی لہٰذا ڈاکٹر اسرار احمد کو بھی جماعتِ اسلامی سے نتھی کر کے اور ان کی تنظیم کو جماعتِ اسلامی کا چربہ قرار دے کر ان کے خلاف معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔

حالانکہ جماعتِ اسلامی نے ''اقامت دین'' کے اپنے نصب العین کی جس طرح سے وضاحت کر رکھی تھی اور اس اپنا مقصدِ اولین قرار دیا تھا، تو یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے کٹھ پتلی حکمران اور ان کے غیر ملکی آقا اسے اپنا حریف سمجھتے تھے اور اقتدار سے باہر رکھنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ افغانستان میں خانہ جنگی اسلام پسند جماعتوں بالخصوص ''حزبِ اسلامی'' کو اقتدار سے محروم رکھنے کے لئے ہی برپا

کی گئی تھی اور جب یہ خانہ جنگی طول پکڑ گئی تو اس کے خاتمے کے لئے طالبان تحریک کی اسی لئے مدد کی گئی تھی کہ دینی مدارس کے طلباء کو انہوں نے اپنے لئے ''بے ضرر'' خیال کیا تھا کہ جیسے چاہیں گے انہیں استعمال کر کے اپنے مفادات حاصل کر لیں گے تاہم یہ اور بات ہے کہ طالبان نے اُن کا آلہ ءکار بننے اور ان کی فرمانبرداری کرنے کی بجائے اپنے رب کی فرمانبرداری کو ترجیح دے کر انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

الغرض ہم دیکھتے ہیں کہ اصحابِ قریہ کے ابتدائی دو رسولوں کی طرح اُمت کے یہ دونوں مصلحین یعنی اُسامہ بن لادن اور ڈاکٹر اسرار احمد کوئی اہم کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

اُسامہ بن لادن کے لئے تو سوڈان کی سرزمین تنگ ہونے لگی جبکہ ڈاکٹر صاحب کی تحریک خلافت بھی کامیابی کی منزل کی طرف نہ بڑھ سکی۔ حالانکہ منصفانہ طور پر جائزہ لیا جائے تو ان دونوں مصلحین اُمت کے اجتہادات وزنی اور قابلِ عمل تھے مگر چونکہ یہ دونوں حضرات طبقۂ علماء میں سے بھی نہیں تھے لہٰذا اس لئے بھی ان کے اجتہادات قبول عام حاصل نہ کر سکے۔

فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ (پس ہم نے اُن دونوں کو ایک تیسرے رسول کے ذریعے عزت وتقویت عطا فرمائی) کے قرآنی الفاظ کے مصداق "عمرِ ثالث" (ملا عمر مجاہد)

اللہ تعالیٰ نے شیخ الہند ہی کے مکتبۂ فکر سے ابھرنے والے عالمِ دین، حضرت ملا عمر مجاہد کے ذریعے ان دونوں مصلحین اُمت کو عزت وتقویت عطا فرمائی۔

ملا عمر مجاہد کی حضرت عمر فاروقؓ کے نام کے ساتھ جو ہم آہنگی ہے وہ تو ہے ہی لیکن وہ امر اللہ کے بارے میں بھی وصفِ عمر یعنی شدت وسختی کے حامل ثابت ہوئے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ فعززنا بثالث کے قرآنی الفاظ میں سے ثالث کا لفظ ملا عمر مجاہد کے لئے بطور لقب اختیار کیا جا چکا ہے یعنی انہیں 'عمر ثالث' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ گویا عمر اول حضرت عمر فاروقؓ، عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور عمر ثالث حضرت مُلا عمر مجاہد ہیں۔

ایک اور قابل غور بات ہے کہ ایسے ہی الفاظ نبی کریمؐ نے عمرو بن ہشام (ابوجہل) اور حضرت عمرؓ بن خطاب کے متعلق فرمائے تھے کہ یا اللہ ان دونوں میں سے ایک کے ذریعے اسلام کو عزت و قوت عطا فرما! تو اس کے نتیجہ میں حضرت عمرؓ قبولِ اسلام کے ذریعے دین اللہ اور رسولؐ اللہ کے لئے عزت وتقویت کا باعث بنے تھے۔

اسی طرح دورِ حاضر کے دو مصلحین امت کو بھی ''عمر'' کی شکل میں ہی عزت وتقویت عطا ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے متعلق راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ انہوں نے جماعتِ اسلامی اور دیوبندی مکتبۂ فکر سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اور اس کے لئے غالباً انہوں نے دعائیں بھی ضرور کی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں راقم ڈاکٹر صاحب کی ۱۹۸۷ء میں شائع ہونے والی کتاب 'جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی' کا ایک اقتباس قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے تاکہ دیوبندی مکتبہ فکر کے متعلق اُن کے امید افزاء ونیک خیالات سامنے آسکیں:

"ان حالات میں ضرورت تو اس امر کی ہے کہ طبقہ ءعلماء میں سے کوئی عظیم شخصیت ایسی اُبھر کر سامنے آئے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کی سی عظمت وجلالت نہ سہی کم از کم شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کی سی جامعیت ووسعت کی تو حامل ہو جو اولاً..... ع

" کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو"

کے مصداق 'جماعت شیخ الہند' کے باقیات الصالحات کو جمع کرے اور اس کی منتشر لڑیوں کو از سرِ نو ایک مضبوط رسی کی صورت میں بٹ دے!

ثانیاً ان جملہ دینی عناصر کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو جمعیت علماء ہند کے ابتدائی دور میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے- اس لیے کہ اس کے بغیر پاکستان میں کسی اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے!

تاہم جب تک کوئی ایسی صاحب عزیمت شخصیت سامنے نہیں آتی' ان سطور کا عاجز وناچیز راقم اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہے گا کہ غلبہ اسلام اور اقامت دین کی اُس راست تحریک کے تسلسل کو قائم رکھے جس کے اس صدی کے داعی ءاول تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور داعی ءثانی تھے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم۔"

طبقہ علماء میں سے جس عظیم شخصیت کے مستقبل میں ظہور کی نیک خواہش محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کتاب میں کی تھی' حضرت ملا عمر مجاہد کے اچانک ابھر کر سامنے آنے کی صورت میں پوری ہوئی- شیخ الہند کا مکتبہ فکر انہیں پندرھویں صدی ہجری کا مجدد تسلیم کر چکا ہے۔ اُن کی اسلامی حکومت کے تحفظ کیلئے پاکستان کی تقریباً تمام مذہبی جماعتوں کا "دفاعِ پاکستان وافغانستان کونسل" کے نام سے متحد

ہوجانا اور اسی کونسل کا بعد ازاں متحدہ مجلس عمل کی شکل اختیار کر لینا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُن کا کردار مستقبل میں بہت اہم ہوسکتا ہے۔ اگر وہ نصرت الٰہی سے امریکی افواج کو نکالنے میں کامیاب رہے تو یقیناً وہ اُن تمام صفات سے بھی بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جن کا ڈاکٹر اسرار احمد کے مذکورہ بالا اقتباس میں ذکر کیا گیا ہے۔

اُسامہ بن لادن کو ''عمرِ حاضر'' یعنی ملا عمر مجاہد کی تحریکِ طالبان اور سرزمینِ افغانستان کی طرف سے حاصل ہونے والی عزت وتقویت سے تو سارا عالم واقف ہے مگر ڈاکٹر صاحب کو ''عمرِ حاضر'' کی طرف سے کیا عزت وتقویت حاصل ہوئی؟ اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ درج ذیل نکات میں اسی حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے:

(۱) طالبان تحریک کو ملا عمر مجاہد نے ''سمع وطاعت'' کی بیعت کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ اُن کا یہ عمل روحِ اسلام کے عین مطابق تھا۔ طالبان تحریک کا ابھی تک وجود اور اپنے امیر کی حفاظت کرنا تمام تر اسی بیعتِ سمع وطاعت کا مبارک ثمر ہے۔ مگر پاکستان میں جب ڈاکٹر صاحب نے ''تنظیمِ اسلامی'' کو سمع وطاعت کی بنیاد پر قائم کیا تھا تو ان کے اس عمل کو بے جا تنقید کا نشانہ بنایا گیا حتیٰ کہ اس کے خلاف فتوے بھی جاری کئے گئے تھے۔ ملا عمر نے سمع وطاعت کی بیعت کی بنیاد پر طالبان تحریک برپا کر کے ڈاکٹر صاحب کے مؤقف اور طرزِ عمل کو درست ثابت کر دیا۔

(۲) علمائے دین کی اکثریت نے ''اقامتِ دین'' کو ایک اضافی نیکی قرار دے کر ثانوی حیثیت دے رکھی تھی، ملا عمر مجاہد نے ''تمکن فی الارض'' حاصل کرتے ہی دین اللہ کو نافذ کرنے کے اقدامات کئے اور فریضۂ اقامت دین کو اولین حیثیت دے کر ڈاکٹر صاحب کے اس مؤقف کی تصدیق کر دی کہ اگر دین بالفعل قائم نہ ہو تو اسے قائم کرنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا ایک مسلمان کا اوّلین فرض ہے۔

(۳) طالبان نے افغانستان میں عالمی طاغوتی نظام کے اہم ترین ستون یعنی جمہوریت کو اختیار کرنے کی بجائے امارت یا بالفاظ دیگر خلافت کے نظام کو ترجیح دی اور اُن لوگوں سے کسی قسم کی مصالحت سے انکار کر دیا جو مروجہ طریقۂ کار کے مطابق شراکتِ اقتدار کے متمنی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے متعلق تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ موجودہ جمہوری نظام کو درست نہیں سمجھتے اور بذریعہ انقلاب نفاذِ اسلام کے علمبردار اور پاکستان میں نظامِ خلافت کے قیام کے متمنی ہیں۔

(۴) طالبان نے اپنے ہی ہم مذہب فاسق حکمرانوں اور عمائدین (جہادی کمانڈرز وقبائلی سرداروں) کے خلاف خروج کیا اور ان کے خلاف جہاد وقتال بھی کیا، اپنے اقتدار کے لئے نہیں بلکہ دین اللہ کے لئے۔ اُن کے اس طرزِ عمل نے ڈاکٹر صاحب کے نظریۂ انقلاب کو سچ کر دکھایا۔ طالبان نے اپنے حکمرانوں کے خلاف مسلح خروج کیا تھا کیونکہ افغانستان کے داخلی حالات مسلح خروج کے ہی متقاضی تھے جبکہ پاکستان کے حالات مسلح خروج کے لئے تو سازگار نہیں البتہ غیر مسلح احتجاجی تحریک کے لئے سازگار ضرور ہیں۔ طالبان کے خروج نے اس غلط فہمی کا خاتمہ کر دیا کہ مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج جائز ہی نہیں ہے اور اس طرح انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے نظریۂ انقلاب یا بالفاظِ دیگر نظریۂ خروج کی تصدیق کر دی۔

اُسامہ بن لادن کے متعلق تو راقم کے علم میں نہیں کہ انہوں نے کس کے متعلق امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں تاہم معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان اور سوڈان دونوں ان کی امیدوں کے مرکز تھے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنا مرکز بنا کر طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد کیا جاسکتا ہے تاہم ان کی عزت وتقویت کا باعث ارضِ جہاد یعنی افغانستان ہی بنی جس کی آزادی کے لئے وہ قبل ازیں یہاں مصروف جہاد رہ چکے تھے۔

۱۹۹۶ء میں ناسازگار حالات کی بناء پر اسامہ بن لادن سوڈان کو خیرباد کہہ کر افغانستان تشریف لے آئے جہاں ان کے میزبان جہادِ افغانستان کے دور کے مجاہدین تھے۔

اُن دنوں طالبان تحریک زوروں پر تھی اور فتح جلال آباد کے وقت اسامہ وہاں موجود تھے۔ اب اسامہ بن لادن اور طالبان رہنماؤں کے درمیان ہونے والی دوستانہ مفاہمت کے نتیجہ میں انہیں طالبان کی مستقل پناہ اور حمایت حاصل ہوگئی۔

اُسامہ بن لادن نے ۲۵ مئی ۱۹۹۸ء کو ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے عالمی اسلامی محاذ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ ۷، اگست ۱۹۹۸ء کو کینیا اور تنزانیہ کے امریکی سفارتخانوں میں بم دھماکے ہوئے جس کا الزام اسامہ بن لادن پر عائد کیا گیا تاہم انہوں نے اس کی تردید کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھماکے بھی یہودی سازش تھے۔

اُسامہ بن لادن کی تردید کے باوجود ۲۰ اگست ۱۹۹۸ء کو امریکہ نے سوڈان اور افغانستان پر کروز میزائلوں کا حملہ کیا۔ ان حملوں کا ہدف سوڈان میں تو مبینہ طور پر کیمیائی ہتھیاروں کی فیکٹری کو قرار دیا گیا جو اصل میں ایک دواساز فیکٹری تھی۔ جبکہ افغانستان میں شہر 'خوست' پر حملے کا ہدف اسامہ بن لادن تھے تاہم وہ اس حملہ میں محفوظ رہے۔

جب ۲۰۰۱ء میں امریکہ حملوں کا نشانہ بنا تو اس کا ذمہ دار بھی اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا گیا حالانکہ امریکی سرزمین پر اتنے بڑے حملے کروا دینا اُن کے بس میں نہیں ہوسکتا تھا۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُسامہ بن لادن کا عرب مجاہدین کو جہاد کے لئے تیار کرنا، امریکیوں کے خلاف فتوے دینا، عالمی اسلامی محاذ قائم کرنا اور امریکہ کے خلاف مواصلاتی جنگ (Media War) شروع کرنا، اُن کی ایسی جارحانہ پالیسیاں ہیں جنہوں نے امریکیوں کو مشتعل کر کے افغانستان اور عراق کی گوریلا جنگوں میں اُلجھا دیا ہے۔

ماضی قریب کی مثالیں مثلاً زوالِ برطانیہ اور زوالِ روس یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ ان جنگوں کے نتیجہ میں بالآخر امریکہ جیسی سپر پاور بھی ضرور زوال پذیر ہوگی۔

درحقیقت قوموں کی بقاء اور حفاظت کے لئے جارحانہ پالیسیاں بہت اہم ہوا کرتی ہیں کیونکہ یہ اقوام کو متحد ومتحرک رکھتی ہیں اور انہیں منتشر ہونے سے بچانے کے علاوہ ان پر جمود کی کیفیت طاری ہونے نہیں دیتی ہیں۔

اس حقیقت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ وہ ہندو قوم جو اپنی بزدلی کے لئے مشہور ہے، دوسرے ممالک کے خلاف جارحانہ پالیسیوں کی وجہ سے ہی اپنے وسیع وعریض اور مختلف النوع اقوام پر مشتمل ملک کو متحد ومتحرک رکھے ہوئے ہے۔

مزید براں یہ پالیسی اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کی بقاء وحفاظت کی ضامن رہی ہے۔ غلبۂ اسلام کی منزل بھی جارحانہ پالیسیاں اختیار کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اُسوۂ رسول کریم ﷺ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ ﷺ کا مدینہ تشریف آوری کے بعد قریشِ مکہ کے تجارتی راستوں کی ناکہ بندی کرنا اور اس کے ردِعمل میں غزوۂ بدر کا معرکہ پیش آنا، آپ ﷺ کی جارحانہ پالیسیوں کا ثبوت ہے۔ اس امر پر تو

اختلاف ہوسکتا ہے کہ جارحانہ پالیسی کس وقت اختیار کی جائے؟ البتہ جارحانہ پالیسیوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

الغرض واقعہ اصحابِ قریہ کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمد اور اُسامہ بن لادن دو ایسے ابتدائی مصلحین اُمت ہیں جنہیں امیر المؤمنین ملا عمر مجاہد کی شکل میں عزت و تقویت عطا فرمائی گئی۔ ملا عمر مجاہد کا جو کردار اور اہمیت ہے اس کے متعلق کتابِ ہٰذا میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی عظمت و کردار کو ظاہر کرنے کے لیے درج ذیل آیاتِ قرآنی ہی کافی ہیں:

اا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے اور اچھے عمل کریں گے' وہ انہیں لازماً زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ان کے دین کو جسے اللہ نے پسند کرلیا ہے' لازماً مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا اور ان کی حالت خوف کو لازماً امن سے بدل دے گا - وہ میری (ہی) عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور جو اس کے بعد کفر کرے گا تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں - اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو' امید ہے تم پر رحم کیا جائے گا - اور آپ ﷺ ان کے متعلق جو کافر ہیں' یہ خیال ہرگز نہ کیجیے گا کہ وہ (اللہ کو) زمین میں عاجز کردیں گے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے - اا (سورہ النور 57-55)

" اُن لوگوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے جن سے جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک اللہ اُن کی مدد پر ہر طرح قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے (اور اُن کا قصور صرف یہ ہے کہ) وہ کہتے ہیں کہ ہمارا مالک و پروردگار تو صرف اللہ ہے۔ اور اگر اللہ انسانوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو وہ خانقاہیں، گرجے، عبادت خانے اور مسجد یں ضرور گرادی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے - اور اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے جو (اس کے دین کو قائم کرنے میں) اس کی مدد کرتا ہے - یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے -"

(سورہ الحج 41-39)

اا(یہ مومن وہ ہیں) جنہیں لوگوں نے کہا تھا کہ بہت سے لوگ تمہارے مقابلے کے لیے جمع ہو رہے ہیں پس تم ان سے ڈرو لیکن اس بات نے ان کا ایمان اور بڑھا دیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے - پس(اس ثابت قدمی کا) نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اللہ کا انعام اور فضل لیکر واپس لوٹ آئے، انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا اور وہ رضائے الٰہی کی راہ پر چلے اور اللہ ہی فضل عظیم کا مالک ہے۔ یہ دراصل شیطان تھا جو اپنے ساتھیوں سے تم کو ڈرارہا تھا پس تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ہی ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔ اا

(سورہ ال عمران ۱۷۳-۱۷۵)

اصحابِ قریہ کے رسولوں کے مصداق قرار پانے والے تین مصلحین اُمت راقم کے خیال میں ظہورِ مہدیؒ کے تمہیدی کردار ہیں جو اُن کے ظہور سے قبل کے پُرفتن دور میں اُمت کی رہنمائی کررہے ہیں اور اُمت مسلمہ میں وہی کردار ادا کریں گے جو نبی کریمؐ کے وصال کے بعد دورِ صدیقیؓ میں رونما ہونے والے فتنوں کے سدباب کے لئے حضرت خالد بن ولیدؓ اور اسامہ بن زیدؓ نے ادا کیا تھا جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نبی کریمؐ کسی شخص کو نامزد کئے بغیر دنیائے فانی سے تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ کی وفات صحابہ کرامؓ کے لئے ایک عظیم ترین صدمے سے کم نہ تھی۔ آپؐ کی رحلت کا غم تو اپنی جگہ تھا مگر سب سے بڑی زمینی حقیقت یہ تھی کہ اُمت قیادت سے محروم ہو چکی تھی۔

اس لئے آپؐ کے جانشین کا تقرر جلد سے جلد انتہائی ضروری تھا۔ آپؐ کے خلیفہ کا انتخاب کرنے کے لئے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پیشقدمی کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی تھی جبکہ حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی کہ آپؓ یارِ غار ہیں اور خلافت کے زیادہ مستحق ہیں۔

اس معاملہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک خلافت و امامت کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کے جسدِ خاکی مبارک کی تدفین سے پہلے پہلے اُنہوں نے قضیہء خلافت و امامت طے کرلیا تھا۔

راقم کے خیال میں اُمت اُن دنوں جس بحرانی دور سے گزر رہی تھی، تقریباً اسی قسم کے حالات سے ظہورِ مہدیؒ کے دور سے قبل اسے واسطہ پیش آرہا ہے اور یا پھر آنے والا ہے کیونکہ قیادت کا بحران سنگین ترین ہوتا ہے۔ قیادت کا فقدان فتنوں اور بحرانوں کو جنم دیتا ہے اور پھر قوم کو مستقلاً ان فتنوں میں مبتلا رکھتا ہے جب تک کہ وہ قیادت کا مسئلہ حل نہیں کر لیتی۔

حضرت علیؓ نے شہادتِ حضرت عثمانؓ کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی خلافت کی ذمہ داری صرف اسی لئے قبول کی تھی کہ آپؓ خلافت و امامت کے بغیر اُمت کو اُس بحرانی کیفت میں چھوڑنا ہرگز گوارہ نہیں کرسکتے تھے۔

حضرت مہدیؒ کا دور بھی اگرچہ پرفتن ترین دور ہوگا تاہم اُمت قیادت کے مسئلہ سے دوچار نہیں ہوگی جبکہ ظہورِ مہدیؒ سے قبل کا دور قیادت کے فقدان کی وجہ سے زیادہ پرفتن قرار پاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو بالفعل قائم و نافذ کرنے میں داخلی اور خارجی محاذ پر اہم ترین عملی کردار بالترتیب حضرت خالد بن ولیدؓ اور اُسامہ بن زیدؓ نے ادا کیا تھا -

جس طرح اُن دونوں حضرات نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو بالفعل قائم ہونے میں اُن کی عملی مدد کی تھی' اُسی طرح راقم کے خیال میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر مجاہد انہی دونوں (اندرونی و بیرونی) محاذوں پر درحقیقت ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک خلافت کو بلواسطہ طور پر تقویت فراہم کرنے کا سبب ہی بن رہے ہیں -

تین کردار اور زمین کے تین خسوف

ان تینوں حضرات کی جدوجہد و مساعی کے باوجود اقامت وغلبہء دین کی منزل کوسوں دُور دکھائی دیتی ہے لہٰذا راقم کی رائے یہ ہے کہ زمین کے تین خسوف کے واقعات ان تینوں رہنماؤں کی تکذیب و مخالفت اور انکی جدوجہد میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے ہی وقوع پزیر ہوں گے کیونکہ یہ تینوں رہنما کارِ رسالت ادا کررہے ہیں۔ قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میرے اس خیال کی تائید کرتی ہے:

وَمَآ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ/ (۲۰۸) ذِكۡرٰى قف وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ (۲۰۹)

۱۱ اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اُس کے پاس خبردار کرنے والے آ چکے تھے، نصیحت کے لیے اور نہیں تھے ہم ظلم کرنے والے۔۱۱ (الشعراء 209-208)

پس معلوم یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد پاکستانی قوم، اُسامہ بن لادن عرب قوم جب کہ ملاعمر مجاہد امریکی قوم کے لئے کارِ رسالت انجام دے رہے ہیں۔

خسف بجزیرۃ العرب کے متعلق راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ اس کی خبر خود نبی کریم ﷺ دے چکے ہیں۔ آپ ﷺ کا جزیرۃ العرب کے واقعہ خسف کی نشاندہی کر دینا کس حکمت و مصلحت یا اصول کے تحت تھا؟ درج ذیل نکات میں اسی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

(۱) آپ ﷺ کی بعثتِ عمومی تو پوری نوع انسانی کے لئے ہے تاہم آپ ﷺ کی بعثتِ خصوصی اہل عرب کے لئے ہے اور اسی کے تقاضہ کے طور پر آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں ہی جزیرۃ العرب میں اسلام کو غالب کر دیا تھا۔ اسی طرح اس بعثت خصوصی کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ اپنے ہم قوم افراد پر آنے والے یقینی عذاب خسف کی نشاندہی بھی خود ہی فرما دیتے۔

(۲) مشرق اور مغرب کی دو سمتوں کے تعین کے لئے ایک مرکز کا تعین ضروری تھا اور یہ مرکز چونکہ خود آپ ﷺ کا وطن ہونے کے ساتھ ساتھ کرہ ارض کا مرکز بھی ہے لہذا مشرق اور مغرب کی سمتوں کا تعین جزیرۃ العرب سے ہی ہوگا۔

(۳) آپ ﷺ نے کم از کم ایک خطہ ارض کی نشاندہی اس لئے بھی فرما دی تھی کہ اس کی روشنی میں بقیہ دو خسوف کے تعین میں مدد مل سکے۔ پس جزیرۃ العرب کے معاشی فتنہ کی روشنی میں ہی اس فتنہ میں مبتلا بقیہ دو خطوں کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

(۴) میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسامہ بن لادن کے کارِ رسالت کو تقویت دی جا سکے کیونکہ اُن کے فتاوی اور اجتہادات اس قدر متنازعہ فیہ ہیں کہ جنہیں شاید کبھی بھی قبول عام حاصل نہ ہو سکے۔

بہت قلیل عرصہ کے دوران متعدد اقتدار پرست عرب حکمرانوں کا دنیائے فانی سے کوچ کر جانا عرب دنیا کیلئے ایک عذاب ادنیٰ سے کم نہیں ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسامہ بن لادن عالمِ عرب کے ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور اس سے مستقبل قریب میں عالمِ عرب میں تحویل قیادت کا واضح اشارہ ملتا ہے۔

خسف بالمغرب کی صورت میں عذاب الٰہی کے متعلق ملاعمر مجاہد امریکی قوم کو خبردار کر چکے ہیں۔ اُن کا متعدد مواقع پر امریکی قوم کے نام خطوط لکھ کر حجت قائم کرنا بھی اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ارض پاکستان پر ممکنہ عذاب الٰہی کے نزول کے متعلق ڈاکٹر اسرار احمد پاکستانی قوم کو ایک عرصہء دراز سے خبردار کر رہے ہیں۔ خسف بالمشرق کے باب میں راقم حضرت نعمت اللہ شاہ ولیؒ کی یہ پیش گوئی بیان کر چکا ہے کہ ارض سندھ ایک قیامت خیز زلزلہ سے دوچار ہوگی۔

ارضِ سندھ میں آباد دو بڑی اقوام یعنی قدیم سندھی اور ہندوستان سے آنے والے مہاجر لوگوں کو ممکنہ عذاب الٰہی سے خبردار کرنے کے لئے مصلح پاکستان و مفکرِ اسلام ڈاکٹر اسرار احمد (جو خود بھی ایک مہاجر ہیں) تقریباً بیس سال قبل ''استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ'' نامی کتاب پہلے ہی تصنیف کر چکے ہیں۔ اُس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ تلخ حقائق آج حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ چکے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی و معلومات میں اضافہ کے لئے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) ''پاکستان کے المیے کی ذمہ داری موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں پہلے سے آباد لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عائد ہوتی ہے اُن لوگوں پر جو ہندوستان سے ترکِ وطن کر کے پاکستان آئے اور عرفِ عام میں ''مہاجر'' کہلاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ عالمِ اسباب میں پاکستان کے قیام میں سب سے بڑے کریڈٹ کے مستحق بھی وہی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تحریک پاکستان اصلاً ہندوستان کے مسلم اقلیت والے علاقوں سے ہی ابھری تھی جہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مزاج وافتادِ طبع، ان کے قلبی احساسات اور قلبی رجحانات اور ان کے ارادوں و منصوبوں کا علم ذاتی مشاہدے اور عملی تجربے کی بناء پر حاصل تھا۔ لہٰذا اکھنڈ بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سب سے بڑھ کر خوف اور خدشہ بھی انہی کو لاحق تھا۔''

(۲) ''الغرض، تحریک پاکستان بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی تحریک تھی اور اکثریتی صوبوں کے مسلمان تو بعد میں معاون و مددگار بنے تھے۔ اور قیام پاکستان کا سہرا اصلاً ہندی مسلمانوں ہی کے سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قیامِ پاکستان کے وقت بھی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔ اور وہ آج بھی اس ناقابلِ معافی جرم کی بناء پر بھارت کی ہندو اکثریت کے معتوب ہیں کہ اُن ہی نے 'بھارت ماتا' کے ٹکڑے کرائے تھے لہٰذا ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے'' کے مطابق قیام پاکستان کے مقاصد کی تکمیل اور اس سمت میں فیصلہ کن پیشقدمی کی ذمہ داری بھی سب سے بڑھ کر اب اُنہی لوگوں پر عائد ہوتی تھی جنہوں نے اقلیتی صوبوں سے ترکِ وطن کر کے پاکستان میں سکونت اختیار کی۔ اور ان میں سے بھی خاص طور پر وہ جن کی یہ ''ہجرت جبری'' نہیں بلکہ اختیاری تھی! اور راقم کو یقین ہے کہ ایسے لوگوں میں قدرِ قلیل کے سوا اکثر و بیشتر لوگوں کی یہ نقل مکانی اصلاً مال و دولت کے حصول یا دنیاوی امنگوں کی تکمیل کے لئے نہیں تھی بلکہ قومی و ملی

جذبات اور ملت اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے ولولہ واُمنگ کی بنا پر تھی۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ایک بڑی تعداد، سرہند، سہارن پور، دیوبند وعلی گڑھ، دہلی واجمیر، لکھنو، اعظم گڑھ، فرنگی محل ورائے بریلی اور خیرآباد وعظیم آباد (پٹنہ) کی علمی، دینی اور روحانی وراثت کے حاملوں اور خاص طور پر تحریکِ شہیدین کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کے وارثوں پر مشتمل تھی۔ اگر ان کی اکثریت بھی پاکستان آکر آزادی کے مادی ثمرات ہی کو سمیٹنے میں منہمک ہوگئی اور انہوں نے کاروبار بھی چمکا لئے اور فیکٹریاں بھی تعمیر کرلیں، دولت بھی کمائی اور جائیدادیں بھی بنائیں، عالی شان محل بھی تعمیر کئے اور دنیوی آسائشوں کے ساز وسامان بھی فراہم کئے لیکن نہ ملت کی تعمیرِ نو کی جانب توجہ کی، نہ دین کے احیاء کی طرف توجہ کی، نہ دین کے احیاء کی فکر کی، نہ سماجی انصاف اور سیاسی ومعاشی عدل کے قیام کی جدوجہد کی، نہ ملکی سیاست کو صحت مند خطوط پر پروان چڑھانے میں مؤثر حصہ لیا، نہ قافلۂ ملی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ بلکہ اس کے برعکس جس کے پاس چار پیسے آگئے، اس نے اپنی سابقہ سماجی ومعاشی روایات تک کو خیرباد کہہ کر مغربی تہذیب اور جدید طرزِ معاشرت کو اختیار کرلیا۔ تو محض یہ دلیل کہ ان امور میں مقامی لوگ یعنی پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان بھی تو ان سے پیچھے نہیں اور اس حمام میں تو سب ہی ننگے ہیں، انہیں اپنی خصوصی اور اضافی ذمہ داری سے بری نہیں کرسکتی۔ اور یہ کہ اگر پاکستان پر اپنے مقصدِ قیام سے انحراف کی بنا پر عذاب آیا تو اس کی شدید ترین صورت ان مہاجرین ہی کے حصہ میں آئے گی۔''

مہاجرین کے بعد اب سندھی مسلمانوں کے متعلق اقتباسات پیش خدمت ہیں:

(۳) پاکستان میں پہلے سے آباد لوگوں میں سے میرے نزدیک اُس کی تعمیر وترقی، اس میں اسلامی اقدار کے احیاء اور اسلام کے نظامِ عدل وقسط کے قیام کی سب سے زیادہ ذمہ داری سندھی مسلمانوں کی تھی۔ اس لئے کہ اولاً پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے وہ واحد صوبہ جس میں قبل تقسیمِ ہند مسلم لیگ کی حکومت قائم تھی، سندھ ہی تھا۔ ثانیاً سندھ ہی وہ واحد صوبہ ہے جو اپنی پوری صحیح وسالم حدود اور ایک مکمل کلچرل یونٹ کی حیثیت سے پاکستان میں شامل ہوا تھا۔ ثالثاً پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے وہ واحد صوبہ بھی سندھ ہی رہا تھا جہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی ذہنیت کا کسی قدر اندازہ تھا۔ اس لئے کہ سرحد اور بلوچستان میں تو سرے سے ہندو مُسلم مسئلہ موجود ہی نہیں تھا۔ پنجاب میں انگریز نے مسلمانوں کو دبانے کی بجائے کسی نہ کسی درجے میں سہارا دیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی لہٰذا ہندو ان کا زیادہ استحصال نہیں کرسکے جبکہ سندھ، پورے ہندوستان اور بالخصوص بنگال کی طرح (سندھی) مسلمانوں کو شدت کے ساتھ دبایا اور ان کے مقابلے میں ہندوؤں کی باقاعدہ سرپرستی کی لہٰذا ہندوؤں کے ساہوکارانہ ہتھکنڈوں کا تلخ تجربہ سندھی مسلمانوں کو تھا اور اس اعتبار سے انہیں 'مہاجرین' کے ساتھ ایک گونہ مشابہت حاصل تھی۔ رابعاً: یہ کہ تاریخی اعتبار سے یہ شرف تو صرف سندھ ہی کو حاصل ہے کہ اسلام کی قدیم ترین اور خالص عربی الاصل روایات نے وہاں گہری جڑیں جمائیں۔ مزید برآں سندھ طویل عرصے تک اسلامی علوم کا عظیم گہوارہ بنا رہا۔''

(۴) الغرض ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے''! کا اصول مہاجرین کی طرح قدیم سندھی مسلمانوں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اور اگر اس شاندار ماضی کے حامل صوبے میں دین وشریعت کا استہزاء ہو، اسلامی اقدار وشعائر کا مزاق اڑے، لسانی وصوبائی عصبیت دینی واسلامی عصبیت سے بالاتر ہوجائے، ملی وحدت پارہ پارہ ہوجائے اور اس کی جگہ زبان اور کلچر کے نام پر ہندوؤں کے ساتھ متحدہ قومیت کا پرچار ہو یا خالص مادی نظریات کو فروغ حاصل ہو اور نوجوانوں میں مارکس ازم اور کمیونزم جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہے ہوں، دین دار عناصر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور علماء کرام نہ صرف یہ کہ قال اللہ وقال الرسولؐ ہی میں منہمک رہیں، بلکہ اپنی سادہ لوحی سے دشمنِ دین وملت عناصر کی تقویت کا باعث بن جائیں تو جو ہلکی سے ہلکی بات کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب آگ اور خون کا طوفان آئے گا تو قدیم سندھی مسلمان اور ان کے دین دار عناصر بھی نہیں بچ سکیں گے! اور اگر خدانخواستہ پاکستان کو کچھ ہوگیا تو اس کی ذمہ داری مہاجرین کے بعد سب سے زیادہ قدیم سندھی مسلمانوں پر ہی عائد ہوگی۔''

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے خیالات، حضرت نعمت اللہ شاہ ولی کی پیش گوئی اور دیگر آثار وقرائن کی روشنی میں راقم کا خیال ہے کہ جو عذابِ الٰہی اس علاقہ میں نازل ہونے والا ہے، اس کا دائرہ اثر بھارت کے معاشی دارالحکومت بمبئی تک وسیع ہوسکتا ہے تو پاکستان کے معاشی دارالحکومت کراچی تک بھی وسعت پذیر ہوسکتا ہے۔ (اسے محض اتفاق کہا جائے یا قدرت کی کوئی خاص منصوبہ بندی کہ اس وقت دونو ں ممالک کے وزرائے اعظم بھی ماہرین معاشیات ہیں)۔

کراچی میں ایک طویل عرصے سے جاری بدامنی کا فتنہ (جو از روئے قرآن عذاب الٰہی کی ایک نوعیت ہے) بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس شہر میں بیسیوں جید علمائے کرام وصالحین قتل کئے جاچکے ہوں، جہاں اسلام اور اسلام پسند قیادت کو مسترد کردیا جائے اور سیکولر قوتوں کو ترجیح دی جائے اور جہاں کے حکمران مختلف مقدمات میں مطلوب ملزم بن جائیں، تو اس شہر کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہا

ں عذابِ الٰہی کے نزول کے اسباب اکھٹے ہو رہے ہیں۔

صوبہ سندھ معاشی وتجارتی طور پر پاکستان کا اہم ترین علاقہ ہے۔ چونکہ واقعۂ خسفِ قارون کے تناظر میں خسف کا اہم ترین مقصد معاشی فتنہ کا تدارک ہے لہٰذا ممکن ہے کہ از روئے قرآن اللہ تعالیٰ ہمیں وہی کچھ دکھائے جس سے ہم ڈرتے تھے۔ (سورۃ القصص آیت نمبر ۶)

مطلب یہ ہے کہ امریکہ یا بھارت کے ساتھ جنگ کے نتیجہ میں ہم جس معاشی تباہی کے خوف کا شکار تھے، وہی تباہی ہم پر بطورِ عذاب مسلط کر دی جائے۔ اور یہ بات تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ ہم نے پتھر کے دَور میں بھیج دیئے جانے کی امریکی دھمکیوں کی وجہ سے ہی افغانستان کے متعلق یوٹرن لیا تھا۔

۸، اکتوبر کے زلزلہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف مہم میں امریکہ کا ساتھ دے کر ہم نے اپنے تئیں معاشی تباہی سے بچنے کی کوشش کی تھی لیکن چند منٹوں کی زمینی جُنبش نے اتنی بڑی تباہی ہم پر مسلط کر دی جو غالباً کئی ہفتوں تک دشمن کی بمباری سے بھی ممکن نہ ہو سکتی تھی۔

امریکہ یا بھارت کے ساتھ تصادم کے نتیجہ میں فوری طور پر ہمارے آزاد کشمیر اور صوبہ سندھ کو ہی زیادہ خطرہ لاحق تھا کیونکہ یہی دو اہم ترین علاقے دشمن کا اولین ہدف ہو سکتے تھے۔

ہم نے یوٹرن لیکر اپنی دانست میں اس تباہی سے بچنے کی کوشش کی تھی حالانکہ یہ تباہی تو ہمارا مقدر بن چکی تھی۔

آزاد کشمیر کی تباہی کا منظر تو ہم ملاحظہ کر چکے ہیں جبکہ سندھ (جو اس وقت ملک کی دو معروف سیکولر جماعتوں کا گڑھ بھی بن چکا ہے)، کی تباہی خسف بالمشرق کے ممکنہ عذاب کی صورت میں ہمارے سر پر کھڑی ہے۔

اگر ہم نے اپنا موجودہ طرزِ عمل تبدیل نہ کیا، موجودہ طاغوتی نظام سے بغاوت نہ کی، دین اللہ کو اپنے ملک میں نافذ نہ کیا اور اپنی غلطیوں وکوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے انکا ازالہ نہ کیا تو یاد رکھیں کہ آزاد کشمیر کے زلزلہ سے کہیں بڑا عذاب خسف بالمشرق کی صورت میں ہم پر نازل ہو کر رہے گا۔

بہت سے حضرات بالخصوص تنظیمِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے علم میں یہ بات ہو گی کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد، سانحہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں پاکستان پر عذاب الٰہی کے دوسرے ممکنہ کوڑے کا ۱۹۹۶ء تک برسنے کا خیال ظاہر کرتے رہے تھے۔ اگرچہ وقت کا تعین ان کا محض ایک اندازہ تھا جو پاکستانی قوم کی خوش قسمتی سے سچ ثابت نہ ہوا تاہم پاکستان پر ممکنہ عذاب الٰہی کا تذکرہ وہ اب بھی بڑے شدومد سے کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۹۶ء میں عذابِ الٰہی سے محفوظ رہنے کی وجہ میرے نزدیک پاکستان کے ان دو ادوار میں پاکستانی قوم کی مجموعی کارکردگی کا فرق ہے کیونکہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا دور بدتر تھا بنسبت ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۶ء تک کے دور سے۔ پہلے دور میں قراردادِ مقاصد کے علاوہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دیا گیا تھا جبکہ دوسرے دور میں کافی اچھے کام بھی ہوئے تھے جن کی تفصیل راقم پہلے ہی بیان کر چکا ہے۔ اس بہتر کارکردگی کی بناء پر ہمیں مزید مہلت عنایت کر دی گئی تھی۔

راقم کے خیال میں اس مہلت عمل کی ایک وجہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا میدانِ عمل میں آ کر تحریک خلافت کا آغاز کرنا بھی تھا۔ اُن کی یہ تحریک اگرچہ کامیاب نہ ہو سکی تاہم ۱۹۹۶ء کی مہلت عمل کے خاتمہ سے قبل ہی قدرت الٰہی نے ملا عمر مجاہد کی شکل میں اُنکے افکار ونظریات کو تقویت فراہم کرنے والی ایک شخصیت پیدا فرما دی۔ طالبان کو چونکہ تقویت وامداد ارض پاکستان سے ہی حاصل ہو رہی تھی، اس لئے بھی ہمیں مزید مہلت عطا کر دی گئی تھی۔

راقم کے خیال میں ڈاکٹر اسرار احمد کا تحریک خلافت شروع کرنا، اقامتِ دین کی جدوجہد کی واحد دعویدار 'جماعت اسلامی' کی طرف سے اُنہیں تائید وامداد نہ ملنا (حالانکہ ایک ہی مقصد ہونے کے ناطے اُن کی نصرت وتائید جماعت اسلامی کیلئے تو کم از کم واجب کا درجہ رکھتی تھی)، طالبان تحریک کا اچانک ظہور، جماعت اسلامی اور اس کی اتحادی حزبِ اسلامی کی ناکامی اور اُن کی جگہ طالبان تحریک کا اقامت دین کی علمبردار جماعت بن کر سامنے آنا، یہ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور اب ۸، اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلہ نے بھی اس ربط وتعلق کو واضح کر دیا ہے۔

اس زلزلہ نے ڈاکٹر اسرار احمد کے جہاد کشمیر کے متعلق مؤقف کی تائید کے ساتھ ساتھ اُن کے اس خیال کی تصدیق بھی کی ہے کہ اگر قیامِ پاکستان کے مقصد سے انحراف جاری رکھا گیا یعنی پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہ کیا گیا تو اسے لازماً ایک بہت بڑے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا، دوسری طرف اس زلزلہ کے وقوع پزیر ہونے کی تاریخ (یعنی افغانستان پر امریکی حملہ کے پورے چار سال بعد اسی تاریخ کو اس واقعہ کا پیش آنا)، نے ڈاکٹر صاحب کی تحریک خلافت اور ملا عمر مجاہد کی تحریک طالبان کے لئے مستقبل قریب میں نصرت الٰہی کا واضح اشارہ دے دیا ہے۔ **وما یذکر الا اولوالباب**

چونکہ ابتدائی دو مصلحین امت (ڈاکٹر اسرار احمد اور اسامہ بن لادن) اپنے اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے اور بظاہر مستقبل میں ان کی کامیابی کے امکانات بھی مفقود ہیں لہٰذا خسف بالمشرق اور خسف بجزیرۃ العرب کا عذاب اُن کے اپنے ہم قوم افراد پر ہی نازل ہو گا۔

واللہ اعلم بالصواب

ملا عمر مجاہد نے چونکہ اپنے ملک میں کامیابی حاصل کر لی تھی لہٰذا خسف بالمغرب کا عذاب ان کی اپنی قوم پر نہیں بلکہ ان کی مخالف قوم یعنی امریکہ پر نازل ہو گا جس نے ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر ڈالا تھا۔

اُسامہ بن لادن اور ملا عمر مجاہد کی مساعی وجدوجہد تو ہمیں مکمل طور پر منظم ومربوط نظر آ رہی ہے اور بظاہر ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک خلافت اور انکی تنظیم اسلامی سے ان دونوں کا کوئی ربط وتعلق دکھائی نہیں دیتا ہے تاہم راقم کا خیال ہے کہ ان تینوں رہنماؤں کی مساعی وجدوجہد عنداللہ منظم ومربوط ہے اور وہ وقت بھی انشاءاللہ ضرور آ کر رہے گا جب اُن کی جدوجہد ایک وحدت کی شکل اختیار کر لے گی اور یہ وقت غالباً وہ ہو گا جب ایک معروف درویش صفت رہنما بھی ان تینوں شخصیات کے برحق ہونے کی گواہی دے دے گا۔

شہادت حق دینے والے مردِ مومن کا کردار

لہذا اب ہم اصحابِ قریہ کے واقعہ کی روشنی میں اُس مردِ مؤمن اور مردِ درویش کے کردار پر بحث کرتے ہیں جو ممکنہ طور پر مستقبل میں ظاہر ہوگا اور جس کی شہادتِ حق ان تین مصلحین اُمت کی نُصرت ثابت ہوگی۔ اصحاب قریہ کے واقعہ سے اس مردِ درویش کے متعلق درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) وہ ایک مخلص، صالحِ عمل اور صالح ایمان شخص ہوگا۔

(۲) وہ غالبا شہر کے آخری کنارے پر رہائش پذیر ہوگا۔

(۳) اس کا خروج سرعت کے ساتھ اُس وقت ہوگا جب تینوں مصلحین امت نازک ترین صورتحال سے دوچار ہو چکے ہونگے، یہاں تک کہ انہیں شہید کر دیئے جانے کا حقیقی خطرہ پیدا ہو چکا ہوگا۔ ملاعمر مجاہد اور اسامہ بن لادن کے متعلق تو یہ خطرہ اب بھی بدرجہ اتم موجود ہے تاہم ڈاکٹر صاحب اپنے نظریات کا پرچار ابھی تک دھڑلے کے ساتھ کر رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر بھی وہ وقت آ کر رہے گا۔ بالفرض اگر اُن پر ایسا وقت نہ آیا تو ان کے جانشین کے طور پر ان کے بیٹے حافظ عاکف سعید موجود ہیں جنہیں تنظیمِ اسلامی کی امارت کی ذمہ داری سونپی جا چکی ہے۔

(۴) یہ مردِ درویش کوئی غیر معروف شخص نہیں ہوگا بلکہ لوگوں کی بڑی تعداد اس سے واقفیت رکھتی ہوگی۔ یہ مردِ درویش واقعتاً ایک معروف آدمی ہی ہوگا وگرنہ عام آدمی کی شہادتِ حق میں کوئی وزن نہیں ہوسکتا۔

(۵) ان تینوں مصلحین اُمت کے متعلق اس کی پالیسی قبل ازیں غیر جانب دارانہ سی رہی ہوگی اور ان تینوں کو اُس کی طرف سے کسی قسم کی امداد و نصرت بھی حاصل نہ ہو رہی ہوگی۔

(۶) یہ مردِ درویش اپنی سابقہ غیر جانبداری کی پالیسی کو خیر باد کہہ دے گا اور مصلحت پسندی کا راستہ ترک کر کے راہِ عزیمت اختیار کر لے گا۔

(۷) یہ مرد درویش تینوں مصلحین اُمت کی موجودہ جہادی و انقلابی پالیسیوں کی نہ صرف خود تائید کرے گا بلکہ اپنے زیرِ اثر لوگوں کو بالخصوص اور اپنی قوم کو بالعموم ان کی نصرت و حمایت کرنے کی ترغیب دے گا۔

(۸) عین ممکن ہے کہ مصلحین اُمت کے حق میں صدا بلند کرنے کی پاداش میں اسے بھی شہید کر دیا جائے جیسا کہ اصحابِ قریہ کے درویش شخص کو شہید کر دیا گیا تھا۔

(۹) غالب امکان یہ ہے کہ اُس مردِ درویش کی ممکنہ شہادت یا ایذا رسانی کے بعد ہی خسف کا عذابِ اکبر نازل ہوگا جب کہ باقی چار اقسام کے عذاب اُس کے خروج سے پہلے بھی نازل ہو سکتے ہیں۔ مردِ درویش کی شہادت کو اس عذابِ الٰہی کے نزول کا ہنگامی یا فوری سبب قرار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ "ناقة الله" کی کونچیں کاٹنا عذابِ الٰہی کے نزول کا فوری سبب بنا تھا حالانکہ قومِ ثمود عذابِ الٰہی کی مستحق تو پہلے ہی بن چکی تھی۔

(۱۰) اس مردِ درویش پر ہونے والے ظلم اور اس کے نتیجہ میں عذابِ الٰہی کا نزول بالآخر ایک اسلامی انقلاب کا باعث بنے گا کیونکہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی آخری اُمت میں سے ہونے کے ناطے واقعہ اصحاب قریہ کے مردِ حق گو کی طرح اُس کی شہادتِ حق دنیاوی طور پر رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ ردِ عمل میں ایک عظیم اسلامی تحریک برپا کرنے کا باعث بنے گی۔

راقم نے جہاں تک دیانت دارانہ طور پر غور کیا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مستقبل میں منظرِ عام پر آنے والا مردِ درویش تبلیغی جماعت کا کوئی رہنما ہوگا۔ درج ذیل نکات راقم کی اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) تین مصلحین اُمت اور اُن کی جماعتوں کی طرح تبلیغی جماعت بھی موجودہ عالمی طاغوتی نظام کا براہِ راست حصہ نہیں بنی ہوئی ہے جو ان تمام جماعتوں کو متحد کرنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

(۲) اصحابِ قریہ کے تین رسولوں کی طرح تین مصلحین اُمت اپنی جدوجہد کا لوگوں سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کر رہے ہیں یعنی اُن کی جدوجہد کسی قسم کے مفادات کے حصول یا تحفظ کیلئے نہیں ہے بلکہ اُن کا مقصد صرف اور صرف لوگوں کو کامل عبادت رب کی طرف بلانا ہے۔

یہی خدمت عبادت رب کے قدرے محدود تصور کے ساتھ تبلیغی جماعت بھی انجام دے رہی ہے اور خالصتاً رضائے الٰہی کا حصول ہی اُس کے پیش نظر ہے۔

(۳) تبلیغی جماعت عالمِ اسلام کی سب سے بڑی اصلاحی جماعت ہے جس کا طریقۂ کار منہج عیسوی (یعنی گھوم پھر کر لوگوں کو دعوت دین دینے کا طریقہ) سے بہت حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ نصاریٰ ایک نہ ایک دن اسلام قبول کر لیں گے اسی طرح میرا گمانِ غالب ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ جماعت بھی اپنا منہج ضرور تبدیل کر لے گی۔

(۴) جس طرح فرعون نے موسیٰؑ کو "بے ضرر" خیال کرتے ہوئے ان کی پرورش کی تھی اور جس طرح امریکی و پاکستانی ایجنسیوں نے دینی مدارس کے طلبہ کو بے ضرر خیال کرتے ہوئے انہیں برسرِ اقتدار آنے میں مدد دی تھی، ایسی ہی غلطی دشمنانِ اسلام تبلیغی جماعت کو اپنے لئے بے ضرر خیال کرتے ہوئے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے کر یا اس کے متعلق چشم پوشی کی پالیسی اختیار کرنے کی وجہ سے کر چکے ہیں۔ اُن کی یہ غلطی یقیناً اسلام کے لئے نہایت فائدہ مند ثابت ہوگی۔

(۵) "یخرج الناس من المشرق" کے الفاظ میں جس عظیم عوامی انقلاب کی خبر دی گئی ہے اُس کا مصداق یقیناً تبلیغی جماعت کا خروج ہی قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے لاکھوں کارکنوں کی وجہ سے ایسا کرنے کی مکمل اہلیت رکھتی ہے۔

(۶) کہتے ہیں کہ "حرکت میں برکت ہے۔" تبلیغی جماعت کے کارکن ہر وقت ہزاروں کی تعداد میں دین اللہ کی خاطر حرکت میں رہتے ہیں اور اُن کی اس حرکت کی برکات انشاءاللہ ضرور ظاہر ہوں گی۔

(۷) تبلیغی جماعت نہ صرف ہمارے ملک میں مشہور ومعروف ہے بلکہ عوامی سطح پر نیک نامی کی حامل بھی ہے لہٰذا اس کا خروج عوامی حمایت لئے ہوئے ہوگا بلکہ وہ دیگر جماعتیں جو تبلیغی جماعت کی پالیسیوں سے نالاں ہیں، وہ بھی اس کے خروج پر اس کی ہمنوا بن جائیں گی۔

(۸) تبلیغی جماعت نہ صرف فرقہ واریت سے پاک ہے بلکہ اس نے عقائد وعبادات کے نظام میں بھی ہر قسم کی بدعت سے خود کو پاک رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا اصحاب قریہ کے مردِ درویش کی طرح یہ جماعت بھی اپنے عقائد وعبادات کے درست ہونے کی بناء پر ایک نہ ایک دن اپنے طرزِ عمل کو بہتر بنانے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔

(۹) راہِ عزیمت اختیار کرنے والے مصلحین اُمت بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر تبلیغی جماعت کے مکتبۂ فکر سے ہی تعلق وقرب رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی حمایت میں آواز اٹھانا یا میدانِ عمل میں آنا زیادہ مشکلات کا باعث نہیں ہوگا۔

(۱۰) ''اقصا المدینہ'' کے قرآنی الفاظ بھی نہایت قابل غور اور معنی خیز ہیں۔

'القریہ' کی وسیع اصطلاح کے تناظر میں شہر کے آخری کنارے سے کیا مراد ہوسکتا ہے؟

عالمِ اسلام کی حد کا ایک کنارہ پاک بھارت سرحد ہے اور اس سرحد سے قریب ترین شہر 'شہرِ لاہور'' ہے اور اسی شہر کے مضافات میں ''رائے ونڈ'' کا مقام ہے جہاں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے اور یہیں پر اس جماعت کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے جس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔

(۱۱) تین مصلحین اُمت کی جماعتوں کی طرح اطاعت امیر کا مقدس تصور تبلیغی جماعت میں بھی پایا جاتا ہے۔ تبلیغی جماعت نہ صرف ایک امیر کے تحت کام کرتی ہے بلکہ تمام تبلیغی وفود بھی ایک امیر کی قیادت میں روانہ کئے جاتے ہیں۔ چونکہ تبلیغی جماعت کا امیر جماعت میں اہم ترین حیثیت کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اس کے امیر یا کسی دیگر اہم رہنما کا ذہنی انقلاب پوری جماعت کا عملی انقلاب ثابت ہوسکتا ہے

۔

یقیناً اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اپنے بندوں کے دل پر ہوتا ہے اور وہ جب چاہے اُن کے دل ودماغ میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ حضرت مہدیؒ کے متعلق بھی تو یہ الفاظ روایات میں وارد ہوئے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ ان کی ایک رات میں اصلاح کردے گا۔'' (عن حضرت علیؓ رواہ ابن ماجہ)۔

لہٰذا تبلیغی جماعت کے کسی رہنما کے دل ودماغ میں راتوں رات انقلاب خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چند سال قبل تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع کی کاروائی کی خبر اخبار میں پڑھنے کو ملی تھی جس میں کسی مقرر (افسوس مقرر کا نام راقم یاد نہیں رکھ سکا) نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا: ''جہاد کا وقت ابھی نہیں آیا، جب اس کا وقت آجائے گا تو یقیناً تبلیغی جماعت کے کارکن سر پر کفن باندھ کر میدان میں آجائیں گے۔'' راقم کے خیال میں یہ بیان بہت حوصلہ افزاء ہے اور بعض لوگوں کے ذہنوں میں موجود اس تاثر کی نفی بھی کرتا ہے کہ تبلیغی جماعت والے جہاد کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔

(۱۲) تبلیغی جماعت اُمتِ مسلمہ کا فرض منصبی یعنی دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی المنکر کا فریضہ کسی حد تک سہی، انجام تو بہرحال دے رہی ہے اور مستقبل میں اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس فریضہ کو کما حقہ ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہوجائے۔

المختصر تبلیغی جماعت اگرچہ فی الوقت محدود تصورِ دین پر ہی قانع نظر آتی ہے اور اس نے ''اقامت دین'' ''غلبۂ دین'' ''حاکمیت الٰہیہ'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی اصطلاحات سے قصداً یا مصلحتاً چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے، تاہم درج بالا نکات کے تحت کی جانے والی بحث کا حاصل یہی ہے کہ ہمیں اس جماعت کے متعلق پرامید رہنا چاہئے اور اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے جب یہ جماعت اصحاب قریہ کے مرد درویش اور آل فرعون کے مردِ مومن کی طرح چپ کا روزہ توڑ کر موجودہ طاغوتی نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی اور اُن لوگوں کی نصرت کا باعث بنے گی جو اس کے خلاف برسرپیکار ہیں۔

راقم کے خیال میں مستقبل میں ظاہر ہونے والے مردِ درویش کا خروج حضرت مہدیؒ کے ظہور کی تمہید ہے اور یہ اُمت کے لئے ایک 'ریہرسل' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک ناکام ریہرسل ہوگی لیکن ظہورِ حضرت مہدی کے تمہیدی انقلاب (خروج بالمشرق) کی کامیابی کا باعث بنے گی۔ جس طرح ظہور مہدیؒ سے قبل ان کے ظہور کا غلغلہ بلند ہوچکا ہوگا اور لوگ نہ صرف ان کے ظہور کے منتظر ہوں گے بلکہ انہیں تلاش بھی کریں گے، بالکل اُسی طرح ''مردِ درویش'' کے خروج اور ظہور کا لوگ نہ صرف انتظار کریں گے بلکہ اس کی شناخت کر لینے والے اُسے خروج پر آمادہ کرنے کی کوششیں بھی کریں گے۔

شہادت عظمیٰ کے مقام ومرتبہ پر فائز ہونے والا یہ 'نفس ذکیہ' کون ہے؟ اور یہ عظیم سعادت کس خوش نصیب کے حصہ میں آنے والی ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں مستقبل میں ہی مل سکتا ہے۔

فانتظرو انی معکم من المنتظرین.

چار کرداروں کی ممکنہ وحدت

ان چار کرداروں میں سے چوتھا کردار یعنی 'مردِ درویش' کا کردار قدیم ترین ہے اور یہ تاریخ کے ہر دور میں موجود رہا ہے۔ قدامت پسندی اور دین حق کا ایک مخصوص ومحدود تصور اس کردار کا نمایاں وصف رہا ہے۔ یہ کردار بلاشبہ خود تو بے داغ ہوتا ہے تاہم معاشرے کے بے شمار داغ دار کرداروں کو برداشت بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کردار بلاشبہ لوگوں کو اپنے صالح قول وفعل کے ذریعے تو دین حق کی طرف بلاتا رہتا ہے تاہم ان کے ساتھ تصادم سے ہر ممکن گریز کی پالیسی پر بھی گامزن رہتا ہے۔ اُس کی یہ پالیسی بزدلی یا مفاد پرستی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اپنے معاشرے کو پرامن رکھنے اور فساد فی الارض کے امکانات سے دُور رکھنے کی غرض سے ہوتی ہے۔

تاہم اُس کی یہ پالیسی ہر قسم کے حالات میں درست قرار نہیں دی جاسکتی بلکہ ایسی پالیسی بعض حالات میں ظلم اور ظالمانہ نظام کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے اور ظالموں کو اس کردار کے 'بے حمیت' ہونے کا تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی جس کی ایک نمایاں ترین مثال امارت اسلامیہ افغانستان کے خاتمہ پر اُس کی طرف سے اختیار کی جانے والی پراسرار خاموشی و لاتعلقی قرار دی جاسکتی ہے ۔ سقوطِ کابل وقندھار کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہونے والے رائیونڈ کے تبلیغی اجتماع کے موقع پر اس عظیم المیہ کے متعلق خفیف سے ردِ عمل کا بھی ظاہر نہ کیا جانا، یہ تاثر چھوڑے بغیر نہ رہ سکا کہ عالم اسلام کی یہ عظیم

ترین مذہبی تحریک 'دینی حمیت' سے محروم ہوچکی ہے اور یا پھر بعض واقفان حال کے بقول اس تحریک کو 'یرغمال' بنایا جاچکا ہے اور اسلامی انقلاب کے لئے اب اس تحریک سے زیادہ توقعات وابستہ کرنا عبث ہے
۔

اگر چہ راقم اس خیال کو درست نہیں سمجھتا تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تبلیغی جماعت کی اس خاموشی نے اہل باطل کے حوصلوں کو بلند کیا ہے اور وہ روز بروز اسلام اور اسکے نفاذ کی جدوجہد کرنے والی قوتوں پر اپنا شکنجہ مضبوط کرتے چلے جارہے ہیں جس کی تازہ ترین مثال اسلام آباد میں ہونے والا لال مسجد کا سانحہ ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور تھنک ٹینک "رینڈ کارپوریشن" کی رپورٹ کے مطابق قدامت پسند اور محدود مذہبی تصورات کی حامل قوتوں (مثلاً تبلیغی جماعت) کا نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والی قوتوں کے ساتھ اتحاد انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے اور عالم اسلام کے متعلق اُن کے مذموم عزائم کو ناکام بنا سکتا ہے لہذا وہ اس اتحاد کو روکنے کی ہر ممکن کوششیں کررہے ہیں جو انشاءاللہ کامیاب نہ ہوسکیں گی اور ایک نہ ایک دن یہ تمام قوتیں دین حق کے نفاذ کی خاطر میدان عمل میں آکر رہیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ افراد و اقوام پر نازل ہونے والے مصائب، آلام اور سانحات کسی نہ کسی ردعمل کا اظہار ضرور کرتے ہیں خواہ یہ ردعمل ہوش کی صورت میں ہو، جوش کی صورت میں ہو، مایوسی کی صورت میں ہو، پست ہمتی کی صورت میں ہو اور یا پھر بے حسی کی صورت میں ہو۔

1967ء میں قبلہ اول یعنی بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ اور 1971ء میں پاکستان کا دولخت ہونا، تاریخ اسلام کے المناک ترین واقعات میں سے ہے۔ ان واقعات کے نتیجہ میں جوش، مایوسی، پست ہمتی اور بے حسی کے مناظر تو دیکھنے کو ملے مگر ہوش مندی کا مظاہرہ کرنے والے حضرات بہت ہی کم ہوں گے۔ ان ہوش مند حضرات میں سے اہم ترین میرے نزدیک ڈاکٹر اسرار احمد ہیں جنہوں نے زوال اُمت کے حقیقی سبب یعنی 'قرآن حکیم سے دُوری کے مرض' کی تشخیص کرتے ہوئے فہم قرآن کو عام کرنے کے لئے 1972ء میں "انجمن خدام القرآن" قائم کی تھی۔ اُن کی اس تحریک نے ردعمل میں فہم قرآن کی دیگر بہت سی تحریکوں کو جنم دیا تھا اور آج قرآن کا فہم اور پیغام ایک بہت بڑے طبقہ کو پہنچ چکا ہے تو یقیناً اسے بلواسطہ طور پر ڈاکٹر اسرار احمد کا فیض ہی کہا جاسکتا ہے۔

1990ء کا عظیم ترین سانحہ جس پر قبل ازیں کافی کچھ تحریر کیا جاچکا ہے، بھی اپنا ردعمل ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا لہذا اس واقعہ نے پاکستان میں تو ڈاکٹر اسرار احمد کی "تحریکِ خلافت" کو جنم دیا جبکہ سعودی عرب میں اُسامہ بن لادن کی "تحریکِ القاعدہ" کے قیام کا سبب بنا۔

اس بار ڈاکٹر اسرار احمد نے زوالِ اُمت کے ظاہری سبب یعنی 'ادارہ خلافت' کی غیر موجودگی کا احساس کرتے ہوئے تحریک خلافت کا آغاز کیا تھا جب کہ
اُسامہ بن لادن نے اس واقعہ پر جس ردعمل کا اظہار کیا، اسے ہوش سے زیادہ جوش کا نام ہی دیا جاسکتا تاہم اُن کی نیک نیتی و اخلاص پر ہرگز شک نہیں کیا جاسکتا۔

اگر ایک قبطی کی طرف سے بنی اسرائیل کے ایک فرد پر ڈھائے جانے والے ظالمانہ فعل پر ظاہر کیا گیا ردعمل بالآخر حضرت موسیٰؑ کو نبوت و رسالت کے عظیم مقام و مرتبہ پر فائز کیے جانے کا سبب بن سکتا ہے تو اُسامہ بن لادن کے مخلصانہ ردعمل کو کیوں شک کی نگاہ سے دیکھا جائے اور طاغوتی قوتوں کے خلاف اُن کے جہادی کردار کو تسلیم نہ کیا جائے؟

اُن کے اجتہادات اگر ادارہ خلافت کی سند لیے ہوتے تو یقیناً ان اجتہادات سے خیر زیادہ برآمد ہوتا اور شر و فساد کی پیدائش کم سے کم ہوتی جیسا کہ اس وقت بظاہر نظر آرہی ہے۔

موجودہ حالات میں ایک عام شخص کیلئے یہ فیصلہ کرنا خاصہ مشکل ہے کہ اسامہ بن لادن کی حیثیت ایک 'مصلح' کی سی ہے یا 'مفسد' کی سی کیونکہ اس وقت جو فساد فی الارض نظر آرہا ہے، بظاہر اس کا ایک بڑا ذمہ دار اُنہیں ہی ٹھہرایا جارہا ہے۔

جس طرح ایک مظلوم بنی اسرائیلی کی حمایت میں حضرت موسیٰؑ کا ظالم قبطی کو گھونسا رسید کرنا انکی حمیت و غیرت کا مظہر تھا، اُسی طرح اُسامہ بن لادن کا امریکا کی مسلمانوں کے خلاف ظالمانہ پالیسیوں پر ردعمل ظاہر کرنا اُن کی دینی حمیت و غیرت کا ثبوت ہے۔

اور جس طرح حضرت موسیٰؑ کا منشاء ظالم قبطی کو سبق سکھانا تھا نہ کہ اسے قتل کرنا، اُسی طرح اُسامہ بن لادن کا مقصد تو محض امریکی مظالم کا جواب دینا تھا نہ کہ اُس نام نہاد دہشت گردی کو فروغ دینا جسکا انہیں ذمہ دار ٹھہرایا جارہا ہے۔

لہذا مجاہد اسلام اسامہ بن لادن کو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کریں اور سب سے پہلے زوال امت کے سب سے بڑے ظاہری سبب کو دور کرنے کی کوشش کریں یعنی ادارہ خلافت کو از سر نو بحال کرنے میں اپنا کردار ادا کریں جس کے قیام کے امکانات اس وقت عالم اسلام کے سیاسی مرکز و قبلہ یعنی پاکستان میں ہی روشن ترین ہیں۔

اگر اُسامہ بن لادن اپنی موجودہ پرتشدد جدوجہد کو چھوڑ کر ڈاکٹر اسرار احمد کے سنت نبوی ﷺ سے اخذ شدہ فلسفہ انقلاب کی اخلاقی و عملی تائید کریں تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اسکے ضرور کچھ نہ کچھ عملی نتائج اُمت مسلمہ کے حق میں ظاہر ہوں گے۔ انشاءاللہ

جہاں تک ملا عمر مجاہد کا تعلق ہے تو اگر چہ ان کی تحریکِ طالبان افغانستان میں جاری سالہا سال کی خانہ جنگی کا ردعمل تھی تاہم اُنہوں نے تمکن فی الارض حاصل ہوجانے کے بعد ہوش اور جوش کے ملے جلے جذبات کا اظہار کیا۔ ملک کے اندرونی معاملات کے متعلق تو انکے فیصلوں کو کافی حد تک ہوش مندانہ قرار دیا جاسکتا ہے مثلاً اسلامی قوانین کا نفاذ اور اسلام سے باغی قوتوں کی سرکوبی وغیرہ تاہم خارجہ معاملات کے متعلق ان کے فیصلوں کو ہوش مندانہ کی بجائے جوشیلے فیصلے ہی کہا جاسکتا ہے۔

اسلام کے ایک مؤثر قوت بننے سے پہلے حضور اکرم ﷺ کے یہود اور قریش مکہ کے ساتھ معاہدات ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ پس دنیا جہاں کی قوتوں کے ساتھ بیک وقت محاذ آرائی مول لینے کے عمل کو دانش مندانہ اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تاہم میرے نزدیک طالبان کی سب سے بڑی غلطی اپنے پڑوسی ملک پاکستان میں جاری تحریک خلافت کی تائید و نصرت نہ کرنا ہی ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے جب پاکستان و افغانستان کی کنفیڈریشن کے قیام کی تجویز دی تھی تو ملا عمر مجاہد کو نہ صرف اس تجویز کی تائید کرنی چاہئے تھی بلکہ اُن کی تحریک خلافت کو سپورٹ کرنے کا اعلان بھی کرنا چاہئے تھا تاکہ اس تجویز پر عمل درآمد کیلئے فضا سازگار بنائی

جاسکتی۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے دورۂ افغانستان کے موقع پر اُن کے قندھار تشریف لے جانے کے دن (۱۶، اپریل ۲۰۰۱) ملاعمر مجاہد کے دستِ راست 'ملا ربانی' کی وفات دراصل ایک اشارۂ غیبی تھا کہ ذات باری تعالیٰ نے انہیں ایک دست راست سے محروم فرما کر اس سے مضبوط دست راست عطا کر دیا ہے مگر لگتا ہے کہ یا تو وہ اس اشارۂ غیبی کو پا ہی نہ سکے تھے اور یا پھر اُس کے حوالہ سے اقدامات کرنے سے بوجوہ قاصر رہے۔

(راقم کے خیال میں تو دوسری بات ہی زیادہ درست معلوم ہوتی ہے)

اگر پاکستان اور افغانستان کی کنفیڈریشن وجود میں آجاتی تو امریکہ، روس یا بھارت میں سے کسی ایک قوت کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ ممکن ہوسکتا تھا اور اس طرح ایک مضبوط اسلامی مملکت کے قیام کی راہ ہموار کی جاسکتی تھی جو مستقبل میں نہائت اہم کردار ادا کرنے کے قابل ہوتی۔

یقیناً پاکستان اس وقت عالم اسلام کا سیاسی مرکز ہے اور اسلام آباد میں اسلام نافذ کیے بغیر موجودہ حالات میں امت مسلمہ کی حالت زار کے سدھرنے کا خیال ایک ایسا خواب ہے جس کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی صورت مستقبل قریب میں نظر نہیں آرہی۔

افغانستان میں جاری تحریک مزاحمت کی حقیقی تائید و مادی امداد تبھی ہوسکتی ہے جب پاکستان میں اس تحریک مزاحمت کو سپورٹ کرنے والی حکومت وجود میں آجائے۔

لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ واقعہ اصحابِ قریہ کی سی پستی و تنزل میں چلی جانے والی امت مسلمہ فی زمانہ اس واقعہ کے کرداروں کی مثال پر پورا اترنے والے قائدین کو پہچانے اور اُن کی تائید و نصرت کے لئے میدان عمل میں آجائے۔

تاہم جب تک یہ چار کردار اقامت دین و غلبہء دین کے حوالہ سے اپنے اپنے درست مقام و کردار (Role) کو پہچان کر خود ایک وحدت کی صورت اختیار کرتے ہوئے ایک الجماعۃ کی صورت میں نہیں ڈھلیں گے، اُس وقت تک کوئی مثبت عملی نتیجہ اسلام کے حق میں ظاہر نہیں ہوسکے گا۔

ان چار کرداروں میں سے اسامہ بن لادن اور ملاعمر مجاہد کے مابین وحدت تو پہلے سے ہی موجود ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے دورہ افغانستان اور پاک افغان کنفیڈریشن کے قیام کی تجویز کی صورت میں اس دو رکنی وحدت کی تائید کر کے اپنے ذمے 'حق نصرت و تائید' ادا کر دیا تھا مگر اسامہ بن لادن اور ملاعمر مجاہد کے ذمے یہ قرض ابھی تک باقی ہے۔

راقم کے خیال میں جب اس وحدت کے تین مرکزی کردار اور اُن کی تحاریک ایک وحدت کی شکل اختیار کرتے ہوئے مشترکہ جدوجہد کا آغاز کریں گی تو ہی اس بات کی امید کی جاسکے گی کہ اب اس وحدت کا چوتھا ممکنہ کردار یعنی تبلیغی جماعت بھی اس میں شامل ہو کر اسلامی انقلاب کیلئے میدان عمل میں آجائے گا۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس وحدت کا 'امیر' کون ہونا چاہیے؟ تو میں یہ فیصلہ ان رہنماؤں کی صوابدید پر، آنے والے وقت پر اور اپنے معزز قارئین کے دینی فہم و فراست پر چھوڑتا ہوں۔

تاہم ایک خیال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ وحدت اُمت کے نشان حضرت الامام المہدی اُس وقت تک ظہور نہ فرمائیں گے جب تک ہم خود وحدت اُمت کی ایک ادنیٰ مثال قائم نہ کر چکے ہونگے۔

درحقیقت فی زمانہ موجود چار کرداروں کا متحد ہونا اور اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا امیر تسلیم کر لینا ایک ایسا معرکہ ہے جس میں وحی جلی کی رہنمائی کے بغیر کامیابی کی صورت میں ہم حضرتِ انسان کو خلافت ارضی عطا کیے جانے کے خدائی فیصلہ کو حق بجانب ثابت کر سکتے ہیں اور اس طرح نصرت الٰہی کے امیدوار و سزاوار بھی بن سکتے ہیں۔

گویا یہ معرکہ درحقیقت معرکہء آدمؑ و ابلیس ہے، یہ معرکہء عجز و کبر ہے، یہ معرکہء انابت و بغاوت ہے اور یہی وہ معرکہء خلافت ہے جس کیلئے حضرت انسان کو تخلیق کیا گیا ہے اور جو اس وقت ہمارے ان قائدین کو درپیش ہے اور یقیناً اسے تاریخ انسانی کا عظیم ترین معرکہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ان رہنماؤں کو یہ معرکہ بخوبی سر کر لینے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

راقم کو بہت حد تک امید ہے کہ واقعہ اصحاب قریہ کے مصداق قرار پانے والے ان کرداروں کے مابین مستقبل قریب میں وحدت ضرور قائم ہوگی اور اس کے نتیجہ میں پاک افغان وفاق بھی ضرور قائم ہوگا۔ غالباً اس وفاق کے وجود میں آنے کا ردعمل ہی ہوگا کہ مشرق وسطیٰ میں "سفیانی" نامی شخص اس وفاق کے متوازی ایک روشن خیال قسم کا وفاق تشکیل دینے کی کوشش کرے گا۔ مغربی قوتوں کی جانب سے ایک نئے مشرق وسطیٰ کے قیام کا اعلان شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ممکنہ طور پر قائم ہونے والے ان دونوں وفاقوں کے مابین بنیادی فرق صرف یہ ہوگا کہ مشرقی علاقوں میں قائم ہونے والا پاک افغان وفاق حقیقی اسلام کا نمائندہ ہوگا جبکہ مشرق وسطیٰ میں قائم ہونے والا وفاق مسخ شدہ اسلام کی نمائندگی کرے گا۔

ان دو متضاد، متصادم و متحارب وفاقی حکومتوں کا قائم ہونا ہی راقم کے خیال میں وہ "اختلاف اُمت" ہے جس کا روایات میں ذکر کیا گیا ہے اور جو ظہور حضرت مہدی سے قبل رونما ہوگا اور اس اختلاف کے خاتمہ کے لئے ہی آل رسول ﷺ سے حضرت مہدی کا ظہور ہوگا کیونکہ اس کے خاتمہ کے لئے آل رسول ﷺ کی ایک 'موعود' شخصیت ہی موزوں ترین ہوسکتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

(باب ہفتم)

متفرقات

(۱) عذابِ خسف دو احادیث مبارکہ کی روشنی میں

پہلی حدیث: ترمذی شریف میں حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا! ''اس اُمت میں تین طرح کے عذاب نازل ہوں گے، زمین کے دھنسنے سے، صورتوں کے مسخ کرنے سے اور سنگباری سے اور یہ اُس وقت نازل ہوں گے جب گانے والیوں اور آلات موسیقی کا چرچا ہوگا اور شراب نوشی عام ہو جائے گی۔''

اس روایت کی روشنی میں غور کیا جائے تو بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ شوبزنس

(Showbuisiness) کے دو اہم ترین مراکز

ہالی وڈ (Hollywood) (امریکہ کی فلم انڈسٹری کا نام) اور

بالی وڈ (Bollywood) (بھارت کی فلم انڈسٹری کا نام)

اس روایت میں بیان کئے گئے تمام خبائث کے نہ صرف کامل مصداق بن چکے ہیں بلکہ علامات (Symbols) کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

ہالی وڈ کے متعلق پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں واقع ہے۔ لہٰذا نبی کریمؐ کی یہ حدیث بھی میری اس رائے کی تصدیق کرتی ہے کہ خسف بالمغرب کا واقعہ امریکی ریاست کیلی فورنیا میں پیش آئے گا۔

جہاں تک بالی وڈ کا تعلق ہے وہ تو بھارت کے معاشی دارالحکومت بمبئی یا ممبئی میں واقع ہے اور حضرت نعمت اللہ شاہ ولی کی پیشگوئی کے تناظر میں راقم یہ بات ثابت کر چکا ہے کہ خسف بالمشرق کے عذاب کا نشانہ بھارتی علاقے بھی بنیں گے۔ نبی کریمؐ کی یہ حدیث میرے اس خیال کو مزید تقویت فراہم کرتی ہے۔

روایت مذکورہ بالا میں بیان کئے گئے خبائث کا مرکز جزیرۃ العرب کی خلیجی ریاستیں بھی بدرجہ اتم بن چکی ہیں۔ متحدہ عرب امارات کا شہر ''دوبئ'' تو اس حوالے سے بالخصوص شہرت کے بامِ عروج کو پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا راقم کا یہ تجزیہ کہ خسف بجزیرۃ العرب کا مرکز یہی علاقہ ہوگا، اس حدیثِ نبویؐ کی رو سے بھی درست قرار پاتا ہے۔

دوسری حدیث: مشکوٰۃ شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا! ''اس اُمت میں زمین میں دھنسنے اور صورتوں کے مسخ ہونے کا عذاب واقع ہوگا اور یہ عذاب منکرینِ قدر (تقدیر) پر واقع ہوگا۔''

حدیث درج بالا میں بیان کیا گیا ہے کہ خسف اور مسخ کا عذاب اُن لوگوں پر نازل ہوگا جو تقدیرِ الٰہی کے منکر ہوں گے، لہٰذا سب سے پہلے قدر یا تقدیر کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے۔

'قدر' کے معانی درج ذیل ہیں:

کسی چیز کی انتہا، کسی چیز کا معین اندازہ یا پیمانہ، طاقت وقوت، عزت ووقار۔

اصطلاحی معنوں میں قدر یا تقدیر کا مطلب اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے، نے اپنی ہر مخلوق کی زندگی کے متعلق ایک مخصوص اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ یہ اندازہ اس کی عمر، رزق، جسمانی قوت اور ذہنی صلاحیتوں الغرض اس کی ساری زندگی کو محیط ہے۔ نہ تو کوئی مخلوق اللہ کے ہاں مقررہ ایک مخصوص پیمانے سے زیادہ رزق حاصل کر سکتی ہے، نہ ایک مخصوص حد سے زیادہ جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتی ہے اور نہ ہی ایک مقررہ اجل سے زیادہ حیات پا سکتی ہے۔ مزید برآں ہر مخلوق کا دائرۂ عمل یا دائرۂ اختیار لامحدود نہیں بلکہ محدود ہے اور اس حد کا علم بھی صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔

ایمان بالقدر کے ذیل میں یہ حقیقت بھی آ جاتی ہے کہ انسان کو زندگی میں جو بھی بھلائی یا برائی حاصل ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اِذن اور اس کے مقرر کردہ اندازے (تقدیر) کے مطابق ہی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی تقدیر کا سب سے بڑا مظہر 'رزق' ہے جو اللہ تعالیٰ اسے ایک مخصوص اندازے کے مطابق ہی عطا کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ط/ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ/ (٦٢)

''اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہے اپنے بندوں میں سے اور تنگ کر دیتا ہے (رزق) اُس کے لئے، جس کے لئے وہ چاہے۔ یقیناً اللہ ہر بات سے پوری طرح باخبر ہے۔''

(العنکبوت ۶۲)

قرآن کریم میں اس مضمون کو بار ہا ارشاد فرما کر اسکی اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔

ایمان بالقدر کا ایک اور پہلو اللہ کی طاقت وقدرت پر ایمان ہے۔ایک انسان کا عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ طاقت وقوت کا حقیقی سرچشمہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔عزت ووقار کا اصلی حقدار و سزاوار بھی وہی ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والی ہستی بھی صرف اُسی کی ذات ہے۔

ان سب باتوں پر ایمان کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا کی اشیاء ونعمتوں پر جو تصرف واختیار انسان کو عطا کیا ہے، وہ صرف اس کی امانت ہے اور اس عطا کردہ امانت کے متعلق روزِ قیامت کو اللہ کی بارگاہ میں جوابدہی کرنا پڑے گی۔اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کے ذریعے ہدایتِ آسمانی نازل فرما کر انسان کو حلال وحرام کی حدود وقیود سے آگاہ کر دیا ہے۔ جو انسان ان حدود وقیود کی پرواہ نہ کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور اختیارات میں غیر قانونی تصرف کی وجہ سے خیانت کا مرتکب قرار پائے گا۔اور جو شخص اپنے پروردگار کی نعمتوں اور اختیارات میں اس کے مقرر کردہ دائرۂ کار کے اندر رہتے ہوئے تصرف کرے گا، وہ یقیناً حقِ امانت کو ادا کرنے والا بن جائے گا۔اور اس حقِ امانت کو ادا کرنے کی وجہ سے وہ اُس خلافت کا حق ادا کرنے والا بن جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے اسے بحیثیت ''خلیفۃ اللہ فی الارض'' اس کرۂ ارض پر عطا کی ہے۔

لیکن جب انسان عقیدۂ تقدیر سے قولاً یا فعلاً رُوگردانی کرتا ہے، تو وہ اسے حاصل تمام نعمتوں واختیارات کا مالک خود بن بیٹھتا ہے۔وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود وقیود کی حرمت پامال کرتا ہے۔ان نعمتوں واختیارات کو اپنے پروردگار کی امانت سمجھنے کی بجائے ان پر خود کو ''قادر'' سمجھنے لگتا ہے اور اپنے اس طرزِ عمل کی وجہ سے گویا وہ خود ہی ''کاتبِ تقدیر'' بن بیٹھتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی نعمتوں واختیارات پر خود کو ''قادرِ مطلق'' سمجھ کر اللہ رب العزت کی قدرتِ کاملہ کا (اپنے قول یا فعل سے) منکر بن جاتا ہے۔قرآن کریم کی درج ذیل آیات اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (٤) اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ (٥) یَقُوْلُ اَهْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا (٦) اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗٓ اَحَدٌ (٧) اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ (٨) وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ (٩) وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (١٠)

''بالتحقیق ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا (یعنی اسے مشقت بھری زندگی عطا فرمائی)۔کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر قدرت رکھنے والا کوئی نہیں؟ (وہ انتہائی فخر کے ساتھ) کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال (فضول خرچی میں) اُڑا دیا۔کیا وہ سمجھتا ہے کہ (اس مالِ امانت کو بے تحاشا خرچ کرنے کی خیانت پر) اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں عطا نہیں کی ہیں؟ اور زبان اور ہونٹ (بھی عطا نہیں کئے ہیں)؟ اور (اسی طرح سے) ہم نے اسے (خیر وشر کی) دونوں راہیں بھی دکھا دی ہیں (تاکہ وہ دیکھ سمجھ کر جس راہ کو چاہے، اختیار کر لے)۔''

(سورۃ البلد ۱۰ ۴)

پس یہ انکارِ تقدیر کا فتنہ ہی ہے جو انسان کو حکومت واختیار حاصل ہو جانے پر ''فرعون'' بنا دیتا ہے اور بے تحاشا مال ودولت حاصل ہو جانے پر ''قارون'' بنا دیتا ہے۔جس قدر کسی کو حکومت واختیار حاصل ہوتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا فرعون بن بیٹھتا ہے اور جس قدر کسی کو اللہ تعالیٰ مال ودولت سے نواز دیتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا قارون بن بیٹھتا ہے۔الا ماشاء اللہ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں و اختیارات کو اس کی امانت سمجھ کر ان میں تصرف کرتے ہیں۔

طالبان نے حکومت واقتدار (تمکن فی الارض) کو اللہ رب العزت کی عطا کردہ امانت سمجھ کر اپنے زیرِ تصرف علاقہ میں اللہ کا دین نافذ کرنے کی کوشش کی تھی جسے وقت کے فرعون وقارون برداشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنی سی سعی کر کے اُس ریاست کو ختم کر ڈالا جس میں اللہ کے دین کے مطابق تصرف کیا جا رہا تھا، اُن کی مرضی کے مطابق نہیں۔

لیکن انشاء اللہ تعالیٰ خسف، مسخ اور سنگباری وغیرہ کے عبرت ناک عذاب ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیں گے۔

پس حدیث درج بالا بھی زمین کے تین خسوف کے متعلق راقم کے تجزیہ کی تائید کرتی ہے۔

الغرض خسف بالمشرق اور خسف بجزیرۃ العرب کے واقعات،

جزیرہ نمائے عرب اور برصغیر پاک وہند کے جباروں وقارونوں کی سرکوبی، فرعونِ عصر کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدین کی نصرت اور باقی اُمتِ مسلمہ کے لئے تازیانۂ عبرت کے طور پر ظہور پذیر ہوں گی جیسے خسفِ قارون کا واقعہ، قارون کے لئے بطورِ عذاب، حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کے لئے بطورِ نصرت، عام بنی اسرائیلیوں کے لئے بطورِ عبرت اور فرعون کے لئے بطورِ تنبیہ پیش آیا تھا لیکن فرعون نے اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ بالآخر اُس کے غرقاب ہونے کی صورت میں نکلا تھا۔

اُمتِ مسلمہ چونکہ بنی اسرائیل کے برعکس ایک بہت بڑی اور کثیر قومی وکثیر نسلی اُمت ہے لہٰذا اس پر یہ عذاب بھی بڑے پیمانے پر ہی آئیں گی۔

ایک اور تبدیلی جو مرورِ زمانہ اور دورِ جدید کی حیرت انگیز ترقی کے نتیجہ میں واقع ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایک چھوٹی ہلاکت خیزی (Destruction) یا چھوٹا عذاب بھی لوگوں کے لئے باعثِ عبرت ہو سکتا تھا لیکن موجودہ ایٹمی دور میں تو چھوٹے موٹے واقعات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ ان کو عجوبہ قرار دے کر ان کے متعلق خبریں شائع کر دی جاتی ہیں۔

مزید برآں ذرائع ابلاغ کی فراوانی اور ان میں آئے روز انسانی ہلاکتوں کی خبروں نے لوگوں کے اندر 'بے حسی' بھی پیدا کر دی ہے۔حالیہ سونامی اور اب پاکستان کے زلزلے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔کتنے لوگ ہوں گے جنہوں نے اس سے عبرت حاصل کی ہوگی؟ اور ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہوا ہوگا؟ لہٰذا راقم کا خیال ہے کہ زمین کے تین خسوف بہت بڑے پیمانے پر ہلاکت وبربادی کا باعث بنیں گے۔اور ان میں سے ہر واقعۂ خسف سے زیادہ تر آس پاس کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کی ایک مخصوص تعداد ہی عبرت حاصل کرتے ہوئے ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گی۔

(۲) بحرِ ہند کے سونامی ۲۰۰۴ء اور ۸ ،اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلہ کا پیغام

راقم نے چونکہ کتاب ھذا کی تصنیف کا باقاعدہ آغاز سونامی سے متاثر ہوکر ہی کیا تھا لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بحرِ ہند کے حالیہ سونامی کی کچھ تفاصیل بیان کردی جائیں تاکہ قارئین میری اس رائے کے وزن کو محسوس کرسکیں کہ زمین کے تین خسوف بڑے پیمانے پر تباہی کا باعث بنیں گے۔

۱۱ بحرِ ہند کے سونامی کا مرکز انڈونیشیا کا جزیرہ سماٹرا تھا۔اس کا دورانیہ دس منٹ تھا اور اس سے خارج ہونے والی توانائی ایک سو گیگا ٹن کے بم کی طاقت کے برابر تھی۔اس سونامی کی وجہ سے زمین اپنے مدار سے ہل کر رہ گئی تھی جس کی وجہ سے بعض علاقوں کے جغرافیہ میں بھی تبدیلی واقع ہوگئی ہے اور سمندر کی تہہ میں کم وبیش ۸۰۰ میل لمبی دراڑ بھی پیدا ہوگئی ہے۔کم از کم تین لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے جبکہ لاکھوں زخمی و بے گھر ہوگئے۔سب سے زیادہ تباہی مسلم ملک انڈونیشیا میں ہوئی جبکہ سری لنکا، تھائی لینڈ، بھارت اور مالدیپ کے ساحلی علاقوں میں بھی کافی تباہی ہوئی۔۱۱

بعض حضرات کے خیال میں ۲۶ دسمبر ۲۰۰۳ء کو ایران کے شہر 'بام' میں آنے والا زلزلہ اور ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کا سونامی، خفیہ شیطانی قوتوں کی کاروائی تھے مثلاً مسلمان بھارتی دانشور ''اسرار عالم'' اپنی تازہ ترین تصنیف ''معرکہ دجّال اکبر جلد دوم'' میں لکھتے ہیں:

'' ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کو انڈونیشیاء کے آچے صوبہ کے ساحل پر مبینہ طور پر کائنیٹک اسلحہ (Kinetic Weapon) سے حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں پہلے ۸.۹ درجے کا زلزلہ آیا اور (اس کے نتیجہ) میں پھر سمندری لہریں اٹھیں اور پورے بحرِ ہند کے سواحل پر عظیم جانی و مالی تباہی مچادی۔صرف انڈونیشیا کے علاقے آچے (Ache) میں دو لاکھ اموات ہوئیں اور پورا صوبہ تباہ و برباد ہوگیا۔26 دسمبر 2003 میں بام اور 26 دسمبر 2004ء کو آچے میں آنے والے زلزلے قدرتی اتفاقات نہیں بلکہ کوبکی کاروائی تھے۔''

مصنف خفیہ انسانی و شیطانی قوتوں کیلئے کوبکی مقتدرہ کا اِصطلاحی نام استعمال کرتے ہیں۔مصنف نے اس عبارت میں صرف مُبینہ طور پر کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اپنی ان معلومات کا ماخذ بیان نہیں کیا تاہم اُن کی اس رائے کو بالکل رد بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سائنس جس حد تک ترقی کرچکی ہے اور شیطانی قوتیں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے جس حد تک آگے جاسکتی ہیں، تو اس تناظر میں کچھ بھی بعید اور ناممکن العمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

راقم ذاتی طور پر اس خیال سے متفق نہیں ہے کیونکہ اکثر اوقات اس قسم کا جھوٹا پراپیگنڈا بھی کیا جاتا ہے جس کا مقصد مسلم دنیا کو خوفزدہ کرنا اور انہیں اپنے آپ کو شیطانی قوتوں کے سامنے بے بس و کمزور سمجھنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے زیادہ مسلمانوں کے علمی سرمائے کے عالم اور اسے مکمل طور پر ہضم کئے ہوئے ہیں۔عین ممکن ہے کہ زمین کے تین خسوف کی پیشگوئیوں کے تناظر میں انہوں نے بھی حالیہ سونامی کو ان تین خسوف کی تمہید و ابتدائی نشانی سمجھا ہو لہٰذا پراپیگنڈہ کا طوفان برپا کرکے مستقبل کے تین واقعاتِ خسف کی حیثیت کو مشکوک بنانا مقصود ہوتا کہ لوگوں میں ان واقعات سے سبق حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوسکے اور وہ ان واقعات کو انسانی کارنامے قرار دے کر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔

حالیہ سونامی اور پاکستان کے زلزلہ کے بعد ''متاثرین سونامی و زلزلہ کی امداد و بحالی'' کے نام پر فحاشی، عریانی اور بے حیائی کا جو طوفانِ بدتمیزی مختلف رنگا رنگ ثقافتی تقریبات کے ذریعے برپا کیا گیا تھا، اسی امر کی تصدیق کرتا ہے۔

یقیناً خفیہ انسانی و شیطانی قوتیں ہرگز نہیں چاہیں گی کہ زمین کے تین خسوف کے واقعات کے نتیجہ میں پوری دنیا میں بالعموم اور عالمِ اسلام میں بالخصوص توبہ و انابت اِلی اللہ کی کوئی تحریک پیدا ہو۔لیکن اُن کے یہ عزائم انشاءاللہ خاک میں مل کر رہیں گے اور کم از کم عالمِ اسلام میں تو ضرور توبہ و انابت اِلی اللہ کی تحریکیں پیدا ہوگی۔

آدمؑ کی ابلیسِ لعین پر فضیلت توبہ و رجوع الی اللہ کی وجہ سے ہی ہے اور ذُریتِ آدمؑ بفضلِ خدا اپنے اس شرف کو برقرار رکھنے میں ضرور کامیاب ہوگی۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ / (۳۰)

''اور وہ اپنی سی چالیں چل رہے ہیں اور اللہ اپنی سی چالیں چل رہا ہے اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔'' (الانفال ۳۰)

پس زمین کے تین خسوف یا ان میں سے ایک یا دو خسوف خواہ خفیہ شیطانی ہاتھوں کی کاروائیاں ہی کیوں نہ ہوں، ہمارا پختہ ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ہی ہوں گے اور یقیناً مبنی بر حکمت و مصلحت ہوں گے۔خفیہ شیطانی قوتیں جتنے مرضی جتن کرلیں، وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کرسکتیں اور نہ ہی اہلِ ایمان کو شکست دے کر فاتح قرار پاسکتی ہیں۔

تمام نوعِ انسانی کے جدِ امجد حضرت آدمؑ نے جنت کی نعمتوں سے محرومی کے بعد ہی اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے پروردگار سے توبہ کی تھی۔اسی طرح معاشی طور پر خوشحال علاقوں (کرۂ ارض کی مصنوعی جنتوں) کو زمین میں دھنسا دینے کا مقصد نوعِ انسانی کو توبہ کا موقع فراہم کرنا ہوگا۔اور انشاءاللہ تعالیٰ ساری کی ساری ذُریتِ آدم نہ سہی، اس کی ایک قابلِ لحاظ تعداد، زمین کے ان تین خسوف کے نتیجہ میں ضرور توبہ کرلے گی۔قصۂ قارون کو شیطان کے آلہ کار یہودیوں نے غالباً اسی لئے مسخ کردیا تھا کہ لوگ اس کی حقیقت جان کر توبہ کی طرف مائل نہ ہوسکیں لیکن بفضلِ خدا ان کے یہ ناپاک عزائم کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

میری دانست میں بحرِ ہند کے سونامی اور پاکستان کے تباہ کن زلزلہ نے اُمت مسلمہ کو بالعموم اور پاکستانی قوم کو بالخصوص یہ سبق و پیغام دیا ہے کہ ہم مستقبل میں نازل ہونے والے عذاب ہائے الٰہی بالخصوص عذاب خسف کے نزول کا پختہ یقین کرلیں، اس بارے میں کسی قسم کے شکوک و شبہات اگر ہمارے دلوں میں ہیں تو انہیں نکال دیں، اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کریں نہ کہ شیطان ملعون کی طرح مایوسی کا شکار ہوجائیں۔

اور یہ کہ موجودہ حالات میں پاکستان میں اسلامی انقلاب کو ناممکن خیال کرتے ہوئے اُس وقت کے انتظار میں بھی نہ لگ جائیں، جب ہمارے کچھ گروہوں پر عذاب نازل ہوکر ہی اسلامی

انقلاب کی راہ ہموار ہوگی۔ اگر ہم عذابِ الٰہی کے نزول سے قبل ہی اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی اور اس ممکنہ عذاب کو ٹال دے گی۔ اور اگر اس جدوجہد کے دوران عذابِ الٰہی کے مستحق لوگوں پر عذاب نازل ہو ہی گیا تو یہ ہمارے لئے نصرت کا باعث بنے گا اور اسلامی انقلاب کے لئے سازگار فضاء فراہم کرے گا لیکن ہم اپنے 'فریضۃ اقامت دین' کی جدوجہد سے غفلت کے مجرم قرار نہیں پائیں گے۔

اب اس بات کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا کہ آیا ہم ''قومِ یونسؑ'' کی طرح محض آثارِ عذاب دیکھ کر ہی اپنی روش درست کر لیتے ہیں اور یا پھر 'قوم موسیٰؑ' کی طرح اُس وقت تک تجدیدِ ایمان نہیں کرتے جب تک کہ ہمارے کچھ لوگ عذابِ الٰہی کا مزہ نہیں چکھ لیتے۔

تاہم اس موقع پر ایک اہم نکتہ اہل نظر کے لئے قابل غور ہے! اگر ہم قوم موسیٰؑ کی طرح عذاب خسف کے نزول کے بعد تجدید ایمان کرتے ہوئے ایک اسلامی انقلابی تحریک شروع کرتے ہیں تو یہ بات اُمت محمد ﷺ کے شایان شان معلوم نہیں ہوتی۔ اُمت محمد ﷺ کو تو یقیناً بنی اسرائیل پر فضیلت حاصل ہے لہٰذا اس اُمت کے اندر سے کم از کم ایک گروہ لازماً قوم یونسؑ کی طرح محض آثار عذاب دیکھ کر ہی تجدید ایمان کرنے والا اٹھنا چاہیے۔

اس توبہ کا آغاز ہماری سیاسی جماعتوں میں سے کسی ایک کے موجودہ طاغوتی نظام پر مبنی سیاسی عمل کو خیر باد کہہ کر نفاذِ اسلام کیلئے انقلابی طریقہ کار اختیار کر لینے کی صورت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے اور جماعت اسلامی اسکی زیادہ مستحق بھی ہے اور اہل بھی۔

راقم کے خیال میں جس طرح جماعت اسلامی کا الیکشنز کی سیاست میں داخلہ دوسری مذہبی جماعتوں کے لئے ایک رہنما مثال بنا تھا اور دیکھا دیکھی تمام مذہبی جماعتیں سیاست کے اس میدان کارزار میں کود پڑی تھیں، اُسی طرح جماعت اسلامی کا اسے خیر باد کہہ دینا بھی دوسروں کے لئے ایک قابل تقلید مثال ثابت ہوسکتا ہے اور اقامت دیں کے حوالہ سے کھویا ہوا مقام بھی اسے دوبارہ واپس دلا سکتا ہے۔

جماعت اسلامی کے حوالہ سے ایک اور نکتہ قابل غور ہے کہ مولانا مودودیؒ کے مشورہ کو بھی اب قمری حساب سے چالیس سال ہونے کو ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ بنی اسرائیل کی طرح وہ بھی اقامت دین کے درست منہج کو پہچان کر اسے نہ صرف خود اختیار کر لے گی بلکہ دوسری دینی قوتوں کے لئے بھی چراغ راہ بن جائے گی۔

اگر ہم واقعی اپنے ملک میں نفاذ اسلام چاہتے ہیں تو ہمیں ایک نہ ایک دن اپنی موجودہ مصلحت پرستانہ پالیسیوں کو خیر باد کہنا ہی پڑے گا۔

تو کیوں نہ ہم آج سے ہی عزیمت و قربانیوں کا راستہ اختیار کر لیں اور اُن لوگوں میں شامل ہو جائیں جن کا ذکر درج ذیل آیات میں کیا گیا ہے:

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اعلان کیا کہ ہمارا رب (تو صرف) اللہ ہی ہے، پھر اس پر ثابت قدم ہو گئے، نازل ہوتے ہیں ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کہ نہ خوف کھاؤ (مستقبل کی مشکلات کا) اور نہ غم کرو (ماضی کے مصائب کا) اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے (راہِ استقامت اختیار کرنے کے صلہ میں) جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے (فرشتے یہ بھی کہتے ہیں کہ) ہم تمہارے حمائتی و ساتھی ہیں، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اور تمہارے لئے ہوگی وہاں (جنت میں) ہر وہ چیز جس کو تمہارا جی چاہے گا اور تمہارے لئے ہوگی وہاں ہر وہ چیز جو تم منگواؤ گے۔'' (حٰمٓ السجدۃ ۳۰۔۳۱)

(۳) زمین کے تین خسوف کا باہمی ربط اور ان کے ظہور کی ممکنہ ترتیب

اگر بلحاظِ استحقاق دیکھا جائے تو خسف بجزیرۃ العرب کا امکان سب سے پہلے خسف بالمشرق کا اس کے بعد اور خسف بالمغرب کا سب سے آخر میں نظر آتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں سب سے بڑے مجرم تو اہل عرب ہیں جو آنحضورؐ کی دعوت کے اولین مخاطب، آپؐ کے ہم قوم و ہم زبان ہونے کے ناطے دین اسلام کے سب سے بڑے محافظ و پاسبان ہونے چاہئیں تھے لیکن ان کا جو رویہ اور طرزِ عمل ہے، اس پر پہلے ہی بحث کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد خسف بالمشرق کی باری آتی ہے کیونکہ اہلِ عرب کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مسلمان ہی اس وقت اسلام کے ساتھ سب سے زیادہ قرب اور اس کا شعور رکھتے ہیں۔

''خسف بالمغرب' کا مستحق امریکہ اگرچہ دنیا کی نظر میں سب سے بڑا مجرم ہے تاہم غیر مسلم ہونے اور اسلام کی حقانیت و حقیقی تعلیمات سے عدم واقفیت کی بناء پر امریکی قوم مسلمانوں کے مقابلہ میں چھوٹی مجرم ہی قرار پاتی ہے جبکہ مسلمان دینِ مبین اور دینِ امین کے حامل ہونے کے ناطے عنداللہ سزا کے زیادہ مستحق قرار پاتے ہیں۔

اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ 'خسف بالمشرق' اور 'خسف بجزیرۃ العرب' کے واقعات ایک ساتھ رونما ہوں جیسا کہ بحرِ ہند میں آنے والے حالیہ سونامی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کا سونامی بحیرہ عرب میں آتا ہے تو اس سے جزیرۃ العرب اور برصغیر پاک و ہند یکساں طور پر متاثر ہو سکتے ہیں۔ وسیع و عریض بحرِ ہند کے برعکس تنگ اور چھوٹے بحیرۂ عرب کا سونامی کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

تاہم ان خسوف کی ترتیب بالکل اُس طرح بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ روایات میں وارد ہوئی ہے یعنی بالترتیب خسف بالمشرق، خسف بالمغرب، خسف بجزیرۃ العرب۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اکثر اوقات ذاتِ باری تعالیٰ چھوٹی مجرم کی گرفت پہلے کر لیتی ہے اور بڑے مجرم کی رسی دراز کئے رکھتی ہے۔ چھوٹے مجرم کی جلد گرفت کا مقصد بالعموم بڑے مجرم کو وارننگ دینا ہوتا ہے۔ اگر اس ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو بات کچھ اس طرح سے بنتی ہے کہ جب مشرق کی سرزمین کے لوگ 'خسف بالمشرق' کے نتیجہ میں توبہ و استغفار کرتے ہوئے اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو فرعونِ عصر (امریکہ) فرعونِ مصر کی طرح غیظ و غضب میں آ کر ان کے خلاف کاروائی کا آغاز کرنے والا ہوگا اور یا پھر کر چکا ہوگا تو 'خسف بالمغرب' کا عذاب نازل ہو کر اس کے اپنے ملک میں تباہی پھیلا دے گا اور اس طرح اس کے عزائم خاک میں مل جائیں گے۔ مشرق میں اسلامی انقلاب برپا ہو جانے اور مغرب میں فرعونِ عصر کے عبرت ناک انجام کے باوجود بھی جب جزیرۃ العرب کے لوگ ٹس سے مس نہ ہوں گے تو

بالآخران پر بھی "خسف بجزیرۃ العرب" کا عذاب نازل ہو جائے گا۔ یہ عذاب اب اہل عرب کے لئے بھی تازیانۂ عبرت کا کام دے گا اور ظہورِ مہدیؑ کی راہ ہموار کرے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۴) زمین کے تین خسوف کے ممکنہ عالمگیر اثرات

(۱) امریکہ کی سپر پاور حیثیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ امریکہ نام کا ملک دنیا کے نقشے سے ہی غائب ہو جائے۔ اس ضمن میں ایک اور حقیقت مستحضر رہنی چاہئے کہ امریکہ میں صیہونیت نواز پروٹیسٹنٹ فرقہ کے لوگ اکثریت میں ہیں۔ امریکہ کا زوال اس عیسائی فرقہ کا زوال بھی ثابت ہوگا جس کا نتیجہ عیسائیت پر کیتھولک فرقہ کے غلبہ کی صورت میں نکلے گا۔

(۲) زیادہ تر کیتھولک مذہب کی پیروکار یورپی یونین ایک نئی عالمی قوت کی حیثیت سے سامنے آئے گی اور ان عیسائی قوتوں کے ارض فلسطین میں واقع ہرمجدون کے میدان جنگ میں اکٹھا ہونے کا ذریعہ بنے گی۔ یہ خیر و شر کی قوتوں کا وہی آخری معرکہ ہے جسے روایات میں الملحمۃ العظمیٰ کا نام بھی دیا گیا ہے۔

ایک متحدہ یورپ کے خواب کی تکمیل کی خاطر یورپی یونین کا قیام تو محض اس مقصد کے لئے صرف ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل مقصد تو غالباً پاپائے روم کی قیادت و رہنمائی میں قدیم مقدس رومن ایمپائر کا احیاء معلوم ہوتا ہے۔

(۳) خسف بالمغرب کے نتیجہ میں چونکہ امریکہ نواز لبرل یہودی طبقہ بھی اپنا اثر و رسوخ کھو دے گا لہذا اس کا نتیجہ اسرائیل میں اُن بنیاد پرست یہودیوں کے غلبہ کی صورت میں نکلے گا جو عظیم تر اسرائیل کے قیام کے علاوہ مسجد اقصیٰ کو گرا کر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے چاہتے ہیں۔

بنیاد پرست یہودی طبقہ کے غلبہ کی ایک اور وجہ خسف بجزیرۃ العرب کا واقعہ ہوگا۔ اس واقعہ خسف کی وجہ سے عرب دنیا سخت معاشی بحران کا شکار ہو جائے گی جس کا نتیجہ بھی لامحالہ بنیاد پرست یہودیوں کے حق میں ہی نکلے گا اور وہ موقع غنیمت جانتے ہوئے گریٹر اسرائیل کے قیام کی طرف پیش قدمی شروع کر دیں گے۔

درحقیقت زمین کے تین خسوف مجاہدین اسلام (بنیاد پرست مسلمانوں) کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے بنیاد پرست طبقہ کے لئے بھی (اُن کے نقطۂ نظر کے مطابق) نصرت ثابت ہوں گے اور اُن کے اس زعم وغرہ میں اضافہ کا باعث بنیں گے کہ وہ اللہ کے چہیتے اور اُس کے بیٹوں کی مانند ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ خسف بالمشرق اور خسف بجزیرۃ العرب کا نشانہ تو اُن کے حریف مسلم ملک بنیں گے جب کہ خسف بالمغرب کا شکار امریکہ ہوگا جو اُن کے عظیم تر اسرائیل کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

اس حقیقت کے اشارے ابھی سے مل رہے ہیں۔ جب ۲۰۰۵ء میں امریکہ تباہ کن طوفانوں کی لپیٹ میں آیا تھا تو اسرائیل کے چیف ربی (chief rabbi) نے کہا تھا:

"صدر بش اور امریکی عوام پر یہ آفت اس لئے آئی ہے کہ صدر بش نے اسرائیلیوں کو مجبور کیا تھا کہ وہ بعض عرب مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کیلئے علیحدہ ریاست قائم ہونے دیں۔"

بنیاد پرست یہودیوں کے ان گمراہ کن خیالات و نظریات کو مدنظر رکھیں تو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب انکے حریف عالم اسلام کے دو اہم ترین خطے غضبِ الٰہی کا نشانہ بنیں گے اور وقت کی سپر پاور امریکا (جو درحقیقت مسلمانوں اور یہودیوں کے بنیاد پرست طبقات کو قابو میں رکھے ہوئے ہے) بھی عذاب الٰہی کا شکار ہو کر زوال پزیر ہو جائے گی تو انکے جذبات کا عالم کیا ہوگا؟، اس کے کیا نتائج و عواقب ظاہر ہونگے؟ اور یہ بنیاد پرست یہودی طبقہ کیا کیا گل کھلانے کی کوشش کرے گا؟

جب یہ طبقہ گریٹر اسرائیل کے قیام کیلئے آگے بڑھے گا تو اُنکی اس پیش قدمی کو روکنے کیلئے ہی غالباً مشرقی علاقوں سے مسلم افواج جزیرۃ العرب کے علاقہ میں داخل ہوں گی۔ یہی وقت راقم کے خیال میں حضرت مہدی کا ظہور کا بھی ہوگا جو اُمت کو متحد کرتے ہوئے نہ صرف یہودیوں کی اس پیش قدمی کو روک دیں گے بلکہ اپنی جارحانہ پالیسیوں کی بدولت اسلام دشمن قوتوں کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بھی بن جائیں گے۔

(۴) خسف بالمشرق اور خسف بجزیرۃ العرب کے واقعات کے نتیجہ میں اُمتِ مسلمہ میں بالعموم اور اُمت کے دو اُمّ القریٰ ممالک یعنی پاکستان اور سعودی عرب میں بالخصوص توبہ و رجوع الی اللہ کی تحریکیں بھی انشاءاللہ ضرور برپا ہوں گی۔ ان دونوں اُم القریٰ میں اس کے امکانات اس لئے بھی ہیں کہ دور حاضر کے دو مصلحین اُمت کا تعلق انہی علاقوں سے ہے اور مستقبل میں ظاہر ہونے والی دو عظیم ترین شخصیات کا تعلق بھی انہی علاقوں سے ہوگا۔

سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے اسامہ بن لادن حال کے مصلح ہیں تو مستقبل کے عظیم مصلح و مجدد اعظم، خلیفہ راشد حضرت مہدیؑ جن کا اصل نام محمد بن عبداللہ ہوگا، کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہوگا۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر اسرار احمد حال کے مصلح ہیں تو مستقبل میں شہادتِ عظمیٰ کے مقام و مرتبہ پر فائز ہونے والے نامعلوم مردِ درویش کا تعلق بھی اسی سرزمینِ پاک سے ہوگا۔

پھر ایسا کیوں ہوگا کہ پاکستان میں تو اسلامی انقلاب پہلے آئے گا جبکہ سعودی عرب میں بعد میں؟ راقم کے خیال میں اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

(۱) سب سے پہلا فرق پاکستان کا عالم اسلام کے دوسرے اُم القریٰ یعنی افغانستان کے پڑوس میں واقع ہونا اور اسی ناطہ سے حضرت ملا عمر مجاہد کی شخصیت کا ہے۔ مکتبۂ دیوبند سے وابستگی کی وجہ سے اُن کا اثر و رسوخ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر تک پھیلا ؤ رکھتا ہے۔

لہٰذا ارضِ پاکستان میں مستقبل میں آنے والے اسلامی انقلاب میں اُن کا کردار نہایت اہم اور فیصلہ کن ہوگا خواہ یہ انقلاب افغانستان میں ان کی حکومت دوبارہ قائم ہو جانے کے بعد آئے یا پیشتر۔ اور یہ بات تو ہم جانتے ہی ہیں کہ تبلیغی جماعت کا تعلق بھی مکتبہ دیوبند سے ہی ہے جس کا ایک مردِ درویش متوقع طور پر شہادتِ عظمیٰ کے مقام و مرتبہ کو حاصل کر کے پاکستان میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔ اس مسلکی وابستگی و ہم آہنگی کی وجہ سے ملا عمر مجاہد تبلیغی جماعت اور دیوبندی مکتبہ فکر کی دیگر جماعتوں پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں ہیں اور عین ممکن ہے کہ تبلیغی جماعت کا خروج اُن کے ایماء پر ہی ہو۔

(۲) جس طرح نبی کریمؐ نے حرمِ مکہ اور شہرِ کعبہ کو اُس وقت فتح کیا تھا جب اس کی فتح کے لئے حالات انتہائی سازگار ہو گئے تھے اور اس حرمت والے گھر اور سرزمین کے تقدس کے پامال ہونے کا زیادہ خطرہ باقی نہیں رہا تھا، اُسی طرح حضرت مہدیؑ کا ظہور و خروج بھی اُسی وقت ہوگا جب حالات انتہائی سازگار ہوں گے اور حرم مکہ کا کنٹرول پرامن طور پر سنبھالنا ممکن ہو سکے گا۔ سرزمین مشرق کا انقلاب اور اس کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت ظہور مہدیؑ میں مدد و معاون ثابت ہوگی اور اُنکے پرامن ظہور و خروج کو ممکن بنائے گی۔

پس ثابت ہوا کہ زمین کے تین خسوف کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے نئے عالمی منظر نامہ کی وجہ سے ہی حضرت مہدیؑ کا خروج ممکن ہو سکے گا۔

(۳) چونکہ خسف بالمشرق کا واقعہ پاکستان اور بھارت دونوں میں ہوگا لہٰذا اہلِ پاکستان کے لئے اس میں سزا، عبرت اور نصرت تینوں چیزیں پنہاں ہوں گی۔

مخالفینِ اسلام کو ملنے والی سزا سے اہل پاکستان عبرت حاصل کریں گے اور اسے اپنی نصرت خیال کرتے ہوئے میدانِ عمل میں کود پڑیں گے۔ اور بالآخر ظہور مہدیؑ کا تمہیدی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

(۴) پاکستان میں آنے والا اسلامی انقلاب ایک عوامی انقلاب ہوگا جس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے جس کی وجہ سے یہاں سیاسی و سماجی سرگرمیوں پر زیادہ پابندیاں نہیں ہیں۔

چونکہ سعودی عرب میں بادشاہی نظام کی وجہ سے کسی بھی قسم کی سیاسی و سماجی سرگرمیاں ممنوع ہیں لہذا وہاں انقلاب کسی دوسرے اسلامی ملک کی براہ راست مداخلت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر اسرار احمد بجا طور پر جمہوریت کو ''پاکستان کی ماں'' اور اسلام کو ''پاکستان کا باپ'' قرار دیتے ہیں۔ (کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر اور جمہوری طریقۂ کار یعنی انتخابات کے ذریعے ہی وجود میں آیا تھا)۔ اب یہ اور بات ہے کہ پاکستانیوں کی یہ ماں مسلمان نہیں ہے اور اگر ہے تو مکمل طور پر اپنے خاوند (اسلام) کے تابع نہیں ہے اور اسے اپنے خاوند کا تابع فرمان بنانے کے لئے فرزندانِ اسلام کو اپنے باپ کی مدد کرنا ہوگی۔ اور ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب اسے گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رکھا جائے اور گھر کی یہ چار دیواری اللہ تعالیٰ کی حدود و قیود ہیں اور یہ حدود و قیود ایک عوامی اسلامی انقلاب ہی کے ذریعے نافذ کی جا سکتی ہیں۔

بیوی جب ایک حد سے زیادہ نافرمان ہو جائے تو اسے سزا دینے کے لئے شوہر کا حق ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فرزندانِ پاکستان اگر غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلد از جلد اپنی ماں (جمہوریت) کو اپنے باپ (اسلام) کے تابع فرمان نہیں بنائیں گے تو پھر انکے باپ (یعنی اسلام یا بالفاظ دیگر سنۃ اللہ) کو خسف، مسخ اور قذف وغیرہ کے ڈنڈے برسانا ہی پڑیں گے۔

لہٰذا راقم کے خیال میں فرزندانِ پاکستان میں سے سب سے بڑے بیٹے یعنی تبلیغی جماعت کو پہل کرنا ہوگی۔ بڑا بیٹا اُٹھے گا تو سبھی بھائی اس کا ساتھ دیں گے اور ماں بھی اپنے رویے پر ضرور نظر ثانی کے لئے تیار ہو جائے گی۔ تاہم اگر فرزندان پاکستان اور انکی ماں نے اپنی اصلاح کے لئے اقدامات نہ کئے تو پھر عذاب کے ڈنڈے برسانے کا حق باپ پوری طرح محفوظ رکھتا ہے۔ اور ان ڈنڈوں کے برسنے کے بعد تو ہمیں اُمید واثق رکھنی چاہئے کہ اپنے شوہر اور بیٹوں کے عملی اقدامات کے نتیجہ میں تو وہ ضرور اپنی اصلاح پر آمادہ ہو جائے گی وگرنہ پھر طلاق ہی آخری حل ہے اور طلاق اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔

پس ماں (جمہوریت) اور اس کے بیٹوں (جمہوریت پسندوں) کا دینی و دُنیاوی فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنے باپ (اسلام) کے فرمانبردار بن جائیں تاکہ یہ خاندان برقرار رہ سکے۔

ہم کیا چاہتے ہیں؟ اچھی طرح سوچ لیجئے کہ گیا وقت پھر کبھی ہاتھ نہیں آتا۔

راقم کا ذاتی خیال ہے کہ اسلام اور جمہوریت کا امتزاج رکھنے والا یہ خاندان نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ ایک ایسا اسلامی انقلاب برپا کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے گا جو دنیا میں مزید انقلابات کو جنم دے کر عالمگیر اثرات مرتب کرنے کا باعث بھی بن جائے گا۔

آخری گزارش

کتاب ھذا میں زمین کے تین خسوف کے متعلق جو بھی خیالات و تجزیہ پیش کیا گیا ہے، وہ قرآن و حدیث اور دیگر آثار و قرائن کی روشنی میں ہی پیش کیا گیا ہے اور انہیں باقاعدہ پیش گوئیاں خیال کرنا درست نہ ہوگا

.

اس تجزیہ کا مقصد عذابِ الٰہی کے ممکنہ طور پر نشانہ بننے والے علاقوں کا تعین ہے۔ یہ تعین جن وجوہات کی بنا پر کیا گیا ہے، وہ بھی صراحتاً بیان کر دی گئی ہیں۔ اگر ان علاقوں کے لوگ اپنی اصلاح کرتے ہوئے ان وجوہات کو دور کر دیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ خواہ مخواہ ان پر عذاب نازل فرمائے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ/ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ/ (۱۱۷)

''اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق ہلاک کر ڈالے جبکہ وہاں کے باشندے (اپنی) اصلاح کرنے والے ہوں۔'' (ہود ۱۱۷)

لیکن اگر لوگ اپنی اصلاح کرنے کی بجائے شیطان ملعون کی طرح مایوسی کا شکار ہو کر اپنے گناہوں پر اور زیادہ دلیر و جرّی ہو جائیں گے تو پھر عذابِ الٰہی کے ٹلنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے گی جبکہ آخرت کا دائمی خسارہ اس کے علاوہ مقدر بنے گا۔

اگر ایسا ہونا (یعنی اصلاح) ممکن نہ ہو تو پھر ایسے ممکنہ مغضوب و معتوب علاقوں سے ہجرت کر لینا ہی بہترین حل ہو سکتا ہے۔